مجلّہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایما اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا۔

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

# طلوع اسلام

ماہنامہ ــــــــ لاہور

خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25 بی گلبرگ۔ 2 لاہور 54660 ٹیلی فون: 876219 فیکس: 92-42-876219

## فہرست مشمولات


| | | |
|---|---|---|
| لمعات | ادارہ | 2 |
| الصلٰوۃ | علامہ غلام احمد پرویزؒ | 6 |
| موت کا ایک دن معین ہے؟ | بشیر احمد عابد (کویت) | 20 |
| رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم | محمد لطیف چوہدری | 30 |
| مزدوروں کی فلاح و بہبود | بشیر احمد بشیر | 32 |
| فہم قرآن کے متعلق چند گزارشات | محمد ارشاد مری | 36 |
| موت کا ایک دن معین ہے؟ | محمد عمر (گلشن راوی لاہور) | 39 |
| پیام خزاں "95" | منظور احمد خاں (ناروے) | 41 |
| اصلاح معاشرہ کے قرآنی اصول | محمد خالد | 48 |
| ارتقائے حیات | حافظ محمد یعقوب خان تاجیک | 51 |
| الارض للہ | محمد عمر دراز | 52 |
| اجلا" مسمی" | ڈاکٹر سید عبدالودود | 58 |


انتظامیہ:- چیئرمین: ایاز حسین انصاری -- ناظم: محمد لطیف چوہدری
مدیر مسئول: محمد لطیف چوہدری -- مجلس ادارت: میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز -- ناشر: عطاء الرحمٰن ارائیں
طابع: خالد منصور نسیم -- مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز 3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور۔
مقام اشاعت: 25-B گلبرگ 2 لاہور۔ 54660

جلد 48 — شمارہ 10 — اکتوبر 1995ء

بدل اشتراک

فی پرچہ =/10 روپے — اندرون ملک سالانہ 120 روپے — ایشیا' افریقہ' یورپ 550 روپے — آسٹریلیا' امریکہ' کینیڈا 750 روپے

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

## ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

ہمارے ہاں بعض دفاتر میں تعینات غیر ملکی ماہرین کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ مقامی ملازمین وقت پر دفتر نہیں آتے۔ شکایت بجا ہے مگر انہیں شائد معلوم نہیں کہ جس فرد کو ہر صبح پانچ' چھ جگہ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے وہ وقت پر دفتر کیونکر پہنچ سکتا ہے۔ صبح اٹھ کر پہلی قطار غسل خانے کے باہر لگتی ہے۔ دوسری باورچی خانے میں اور تیسری سڑک پر بس یا ویگن کے انتظار میں۔ بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جنہیں براہ راست سواری مل جائے' ورنہ راستے میں جتنی بار ویگن بدلنا ہو گی اتنی ہی بار قطار میں کھڑے ہونا پڑیگا۔ کرایہ بڑھانے کے لئے لمبے روٹ پر ویگن مالکان سفر قسطوں میں طے کرتے ہیں' جس سے لمبے روٹ پر سفر کرنے والے مسافروں کو راستے میں اتر کر اس بس یا ویگن میں دوبارہ سوار ہونے کے لئے جس دھکم پیل سے دوچار ہونا پڑتا ہے' اس کے بعد دفتر پہنچنے پر ان کا تازہ دم رہنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان ساری مشکلات کے لئے وقت کا تعین کر لیا جائے تو بھی ٹریفک جام اور ریلوے کراسنگ پر غیر متوقع انتظار سے سارے تخمینے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ تو تھی ان لوگوں کی مشکل جنہیں تلاش روزگار کے لئے ہر روز گھر سے نکلنا پڑتا ہے اور سالہا سال کی مشقت کے بعد کسی حد تک وہ اس کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں لیکن ان لوگوں کی مشکل اس سے کہیں گھمبیر ہے جو دیانتداری سے حکومت کے محصولات ادا کرنا چاہتے ہیں۔ گھروں میں موصول ہونے والے بجلی' پانی' ٹیلی فون' سوئی گیس اور پراپرٹی ٹیکس وغیرہ کے بل اور ان کی ادائیگی کے مراحل تصور میں لائیے۔ یہ بل یکے بعد دیگرے پورا مہینہ وصول ہوتے رہتے ہیں۔ ادائیگی کی تاریخیں ایک دوسرے سے مختلف' بینک مختلف بنکوں کے اوقات کار مختلف۔ ان سارے بلوں کی ادائیگی کے لئے گھر کے ایک تندرست اور توانا فرد کو' جو یخ بستہ سردی اور چلچلاتی دھوپ میں گھنٹوں قطار میں کھڑا ہونے کی قوت برداشت اور بنک ملازمین کی کڑوی کسیلی سننے کی ہمت رکھتا ہو' کم از کم پانچ بار گھر سے نکلنا ہو گا اور وہ بھی اس صورت میں کہ وہ ایک ہی کوشش میں بل ادا کرنے میں کامیاب ہو جائے ورنہ بنک کی کھڑکی کھڑاک سے بند ہوتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ قطار میں ابھی کتنے لوگ اور کھڑے ہیں۔ بنک ملازمین کا رویہ اس قدر تحکمانہ اور ذلت آمیز ہوتا ہے کہ صارف کو اگر سہولت سے محروم ہو جانے کا خوف نہ ہو تو وہ کبھی ادھر نہ رخ کرے۔ ہماری سرکار کو گلہ ہے کہ لوگ ٹیکس اور محصولات ادا کرنے میں خاطر خواہ دیانتداری کا ثبوت نہیں دیتے' حالانکہ روئے زمین پر شائد ہی کوئی ملک ایسا ہو جس میں ٹیکس ادا کرنے کے اس قدر دشوار

گذار عمل کے باوجود لوگ بلوں کی ادائیگی کے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے نظر آتے ہوں۔

حکومت وقت چاہے تو اس صورت حال کو بیک حکم بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ تمام محکموں کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنے بل مہینے کے آخری ہفتہ میں جاری کریں اور ان کی ادائیگی مہینے کے دوسرے ہفتے میں کی جا سکے۔ نیز یہ کہ بلوں کی ادائیگی ایک ہی جگہ' بیک وقت کی جا سکے جس کے لیے بنکوں کے وقت اور عمے میں اضافہ کیا جائے تاکہ بل ادا کرنے والوں کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ اس طرح نہ تو صارفین کو پورا مہینہ محو گردش (Stand By) رہنا پڑیگا اور نہ ہی بنک پورا مہینہ کھلے رکھنے پڑیں گے۔

یہ قطاریں جن کا ذکر اب تک کیا گیا ہے ان قطاروں کے علاوہ ہیں جو سرکاری دفاتر' کچہریوں اور سرکاری ہسپتالوں میں روز کا معمول ہیں۔ موجودہ حکومت کی عنایات خسروانہ نے ان قطاروں میں اضافہ مزید کیا ہے۔ یہ نئی قطاریں پہلی قطاروں سے بہت لمبی اور پولیس کی لاٹھیوں کے سائے میں لگتی ہیں۔ یہ ان غریبوں کی قطاریں ہیں جو چینی اور گھی کی خریداری کے لئے حکومت کی یوٹیلیٹی سٹوروں کا رخ کرتے ہیں۔ یہ مزدور خود تو مزدوری کے لئے نکل جاتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کو ان قطاروں میں کھڑا کر جاتے ہیں جہاں انہیں گھی اور چینی سستے داموں حاصل کرنے کے عوض' سو دو سو روپے کی اس گھٹیا مال کی خریداری پر مجبور کیا جاتا ہے جس کی نہ انہیں ضرورت ہوتی ہے نہ کوئی دوسرا گاہک اس مال کو خریدنا پسند کرتا ہے۔ نظر آتا ہے یہاں بھی غریبوں کی ہمدردی کی آڑ میں یوٹیلیٹی سٹورز کی گری ہوئی ساکھ بحال کرنے اور گھٹیا مال کی خریداری بڑھانے کا کام لیا جا رہا ہے۔ کیا خوب کہا تھا حکیم الامت نے۔

انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات

جو صبح سے لیکر شام تک قطار میں کھڑا پولیس کی لاٹھیاں اس امید پر کھاتا ہے کہ گھی اور چینی اسے چند ٹکے سستی مل سکے۔

ہمارے سیاسی زعماء جن سے اصلاح احوال کی توقع کی جا سکتی تھی' حکومتوں کے ادھیڑ بن میں مگن ہیں یا لوٹ کھسوٹ میں مصروف۔ انہیں یا تو خبر ہی نہیں کہ عوام پر کیا بیت رہی ہے یا عوام کی مشکلات میں اضافہ ان کے لئے حصول مقصد کا ذریعہ بن رہا ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو ہم یہی کہیں گے کہ

خدا را!! اس قوم کے صبر کو نہ آزمائیں

---

ماہنامہ طلوع اسلام کے پرانے پرچے

1966ء سے لیکر 1994ء تک کے مجلات' مجلد شکل میں موجود ہیں۔

قیمت 100 روپے فی جلد علاوہ محصول ڈاک۔

# ہدیہ سلام بحضور علامہ غلام احمد پرویزؒ

پرویز خوشنوا را ازمن بدہ سلامے
آں درد آشنا را ازمن بدہ سلامے

آں ناقد روایت آں کشتہ حقیقت
آں لالہ گوں قبا را ازمن بدہ سلامے

آں درد خواہ انساں آں چارہ ساز دوراں
آں پیر حق نما را ازمن بدہ سلامے

آں فلسفی نامی ، مفسر گرامی
آں مفی آشنا را ازمن بدہ سلامے

ساز سرود رفتہ ، نقاش صدر اول
شیدائے مصطفیٰؐ را ازمن بدہ سلامے

آں بندۂ مسلماں ، آں رازدان قرآں
آں "شارح قضا" را ازمن بدہ سلامے

آں مرشد جواناں ، آں رہنمائے پیراں
آں مرد باصفا را ازمن بدہ سلامے

آورد کشتی ما بر ساحلے مرادے
پرعزم ناخدا را ازمن بدہ سلامے

خود سوخت و انجمن را تعلیم سوختن داد
آں شمع پر ضیاء را ازمن بدہ سلامے

بہ دیار آں مفکر ، بہ مزار آں مفسر
زود اے صبا! خدا را ازمن بدہ سلامے

از رفیق احمد ساقی، جہلم

# نماز کی اہمیت

[ بانی تحریک علامہ غلام احمد پرویزؒ کا انتباہ ]

میں نے ایسی باتیں بھی سنی ہیں کہ بعض اراکین بزم یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اب جو اسلام کو سمجھا ہے' اس کی بناء پر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا "طلوع اسلام" نے آپ کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز نہ پڑھنے پر فخر کرو؟ آپ نے غیر قرآنی روش زندگی کو تو نہ چھوڑا' اور اس کے بجائے اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اپنے آپ کو طلوع اسلام کی تحریک سے وابستہ ظاہر کر کے ایسی باتیں کرنے لگے۔ طلوع اسلام پر آخر یہ کتنا بڑا الزام ہے جو آپ نے عائد کر دیا۔

ذاتی طور پر مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں اور میں ہمیشہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن یہ انتہائی ظلم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کے لئے جواز کی صورتیں تلاش کرنے لگ جائیں۔ آپ قرآنی نظریات کے خلاف سب کچھ کر رہے ہیں۔ تجارت' کاروبار' شادی' رشتے ناطے سب کچھ ہو رہا ہے۔ بنک بیلنس برابر قائم ہیں۔ قرآن کے مطابق انہیں بدلنے کے لئے آپ کے ذہن میں کبھی کچھ نہیں آیا۔ پھر نماز کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ (بعض گوشوں سے آوازیں آئیں کہ یہ بھی ہمارے مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے جو طلوع اسلام کی تحریک سے وابستگی ظاہر کر کے اس قسم کی باتیں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ محترم پرویزؒ صاحب نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا) ہم معاشرے میں اصلاح کا آغاز اپنے گھروں سے ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر پہلے خود ہی نماز روزہ چھوڑ دیں تو پھر اصلاح کس طرح ہو گی؟ خدا را! اپنے قول و عمل کو بصیرت علم اور خلوص پر مبنی رکھئے۔ "مقدس بہانے" تلاش نہ کیجئے بلکہ اعتراف کیجئے اپنی کمزوریوں کا۔ ہم نے قرآنی معاشرہ قائم کرنا ہے جو صرف نیک اور پاکباز زندگی بسر کرنے سے قائم ہو سکے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

# الصلوٰۃ

## ( قرآن کے آئینے میں )

(ادارہ کے علم میں لایا گیا ہے کہ کچھ لوگ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی پیش کردہ قرآنی فکر کے حوالہ سے لوگوں میں یہ تاثر عام کر رہے ہیں کہ علامہ موصوف موقت فریضہ صلوٰۃ (نماز) کے بارے میں سنجیدہ نہ تھے۔ یہ علامہ مرحوم کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ مرحوم اگر زندہ ہوتے تو اس کا جواب خود دیتے تاہم ان کا کہا ہوا ایک ایک لفظ ادارہ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ ہم اس موضوع پر علامہ مرحوم کا مضمون جو "الصلوٰۃ" کے عنوان سے اکتوبر 1984ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا' دوبارہ شائع کر رہے ہیں' جس سے واضح ہو جائیگا کہ ان تارکین صلوٰۃ کا تحریک طلوع اسلام سے نہ کوئی تعلق ہے نہ واسطہ۔ اس مضمون کا پمفلٹ بھی موجود ہے۔ مدیر مسئول)

پچھلے دنوں ہمیں متعدد استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کی روشنی میں نماز (صلوٰۃ) کا مفہوم و مقصود واضح کیا جائے۔ صلوٰۃ چونکہ اسلامی نظام کی اساس ہے اس لئے اس موضوع پر طلوع اسلام میں جستہ جستہ بکثرت لکھا گیا ہے۔ جامع طور پر یہ موضوع پرویزؒ صاحب کی لغات القرآن میں بارہ تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور مطالب الفرقان۔ جلد اول۔ میں عنوان یقیمون الصلوۃ (آیت 2/3) کے تابع یہ موضوع پورے باب پر محیط ہے۔ ذیل میں اس باب کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی مقام پر تشنگی محسوس ہو تو آپ مطالب الفرقان خود ملاحظہ فرما لیں۔ اس مضمون میں جہاں یہ آئے گا کہ اس کی تشریح دوسرے مقام پر کی جائے گی تو اس سے مراد مطالب الفرقان کا کوئی دوسرا مقام ہو گا۔

اس مقالہ میں بعض اضافے بھی کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے یہ مطالب الفرقان کے مقابلہ میں خود مکتفی ہو گیا ہے۔ (طلوع اسلام)

**صلوٰۃ کے لغوی معنی** صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ل۔ و) ہے ویسے اس کا مادہ (ص۔ ل۔ ی) بھی ہو سکتا ہے۔ (لیکن یہ فنی بحث ہے جسے میں نے "لغات القرآن" میں بیان کیا ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں)۔ بنیادی طور پر اس کے معنے ہوتے ہیں' کسی کے پیچھے پیچھے چلتے جانا۔ چونکہ عرب' نظری اور تجریدی حقائق کا مفہوم محسوسات کے ذریعے واضح کیا کرتے تھے اس لئے ان کے ہاں گھڑ دوڑ میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر اس طرح مسلسل دوڑتا جائے کہ اس کی کنوتیاں پہلے نمبر والے گھوڑے کی سرین سے مل رہی ہوں تو وہ آگے جانے والے گھوڑے کو "سابق" کہتے تھے اور اس دوسرے نمبر

والے گھوڑے کو المصلی۔ اسی بناء پر امام راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (74/43) ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔ لغت کی اہم کتاب تاج العروس میں ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں لزوم (وابستگی) یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس جہت سے قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ صلوٰۃ کے معنے ہوں گے نظامِ خداوندی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا۔ کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ اس بناء پر' صلوٰۃ کے معنی خدا کی طرف سے متعین کردہ فرائضِ منصبی کے بھی آتے ہیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ "الصلوٰۃ" سے مفہوم صرف نماز نہیں۔ اس میں پورے کے پورے قوانین و احکامِ خداوندی اور اس کے عائد کردہ فرائضِ منصبی آجاتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں مومنین کی دعا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1/5) اور سورۂ ہود میں ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (11/56)۔ میرا رب صراط مستقیم پر ہے۔ نظر بظاہر یوں دکھائی دے گا گویا خدا صراط مستقیم پر آگے آگے جا رہا ہے اور مومنین اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی دعا مانگ رہے ہیں۔ (صلوٰۃ میں یہی مفہوم مضمر ہے) لیکن اس طرح کا تشبیہی مفہوم خدا کے تنزیہی تصور کے خلاف ہے اس لئے اس سے مُراد وہ نظامِ کائنات ہو گا' جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہوئے اپنے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ یہ مفہوم سورۂ "النور" کی اس آیت سے نکھر کر سامنے آجاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (24/41)۔ کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ارض و سماوات کی ہر شے اور فضائے سماوی میں پرفشاں پرندے خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب خدا کے علم میں ہے۔" لفظ تسبیح کی تشریح تو آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گی یہاں مجملاً" اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ اس کے معنی ہوتے ہیں' مقصد پیش نظر کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کرنا اور اس کے لئے اپنی بھرپور توانائیاں صرف کر دینا۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتی ہے۔ بات واضح ہے کہ کائنات کی ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہے جس کے لئے انہیں مصروف جدوجہد رہنا ہے۔ یہاں سے صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ فرائض جو خدا کی طرف سے عائد کئے جائیں۔

## ضیاع صلوٰۃ

دوسرے مقام پر قرآن کریم نے خود انسانوں کے متعلق وضاحت کر دی ہے کہ الصلوٰۃ کا مفہوم کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا۔ اس کے قیام سے کیا حاصل ہوتا ہے اور اس کے ضائع کر دینے سے کیا تباہی آتی ہے۔ سورۃ مریم میں پہلے مختلف انبیائے کرامؑ کا تذکرہ آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں خدا نے اپنی

ں سے نوازا تھا۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ
وا الصَّلٰوةَ (19/59)- ان کے بعد' ان کی
ں میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے
ة کو ضائع کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ
ں نے کیا کیا جس سے الصلوٰۃ کا ضیاع ہو گیا۔
وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (19/59)- وہ اپنے پست
ات کے پیچھے لگ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ
مت صلوٰۃ اور اتباع جذبات' دو متضاد چیزیں
ں۔ یہ واضح کیا جا چکا ہے {دیکھئے (1/1)} کہ
ق جذبات کی تسکین بری چیز نہیں بشرطیکہ ان
التزام حدود خداوندی کے اندر رہتے ہوئے کیا
ئے۔ یہ تباہیاں اس وقت لاتے ہیں جب یہ
رکش اور بیباک ہو جائیں۔ لہٰذا الصلوٰۃ کے معنی
ئے انسانی خواہشات و جذبات کی' قوانین
خداوندی کے مطابق' تسکین و برومندی۔ ان سے'
حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کام لینا۔ انہیں
قوانین ہی کے پیچھے پیچھے چلانا۔ ظاہر ہے کہ یہ
صرف اجتماعی نظام کے تابع ہی حاصل ہو سکتا ہے۔
وہ نظام جس میں مختلف افراد اپنے اپنے مفادات
کے پیچھے بھاگنے کے بجائے خدا کے متعین کردہ
نصب العین کی طرف بڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ
قرآن کریم نے اقامت صلوٰۃ کو ایک اجتماعی فریضہ
قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں' بلکہ اس نے یہ بھی
بتایا ہے کہ الصلوٰۃ کا قیام اسی صورت میں ممکن
ہے جب جماعت مومنین کو تمکن فی الارض حاصل
ہو۔ ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں حکمرانی
کتاب اللہ کی ہو۔ چنانچہ سورۃ الحج میں ہے :
اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا
الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

(22/41)- یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہو گا' ان کی اپنی مملکت قائم ہو گی ((24/55)- تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور منکر سے روکیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ نماز پڑھنے اور مروجہ (اڑھائی فی صد) زکوٰۃ دینے کے لئے اپنی حکومت کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ مروجہ طریق پر یہ فرائض ہر حکومت میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ ہمیں انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں بھی نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حق حاصل تھا اور آج ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے۔

## اپنی آزاد مملکت کی ضرورت

متحدہ ہندوستان میں تحریک پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کے ساتھ اس نکتہ پر بھی بحث ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو نماز' روزے کی آزادی ہو گی۔ اس لئے اس مقصد کے لئے مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کی کیا ضرورت ہے؟ انہیں بتایا جاتا تھا کہ نماز' روزہ (اور دیگر اسلامی احکام پر) جس طرح غیر مسلموں کی حکومت میں عمل کرنے کی اجازت ہوتی ہے-' اس سے ان احکام کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو قرآن کی بنیادوں پر قائم ہو۔ حتیٰ کہ اگر مسلمانوں کی حکومت بھی غیر قرآنی اصولوں پر قائم ہو تو اس میں بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی مملکت کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے۔ کہ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (42/38)- مومنین وہ ہیں جو خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں- اس کے احکام کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہیں- یعنی اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں اور اپنے تمام معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں- اور جو رزق خدا نے انہیں دیا ہے اسے نوع انسانی کی عالمگیر ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں-" (یہی ایتائے زکوٰۃ کا مفہوم ہے) یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوٰۃ وہ نظام مملکت ہے جس میں تمام امور جماعت مومنین کے باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں اور جس کا بنیادی فریضہ نوع انسان کی ربوبیت ہے- یعنی تمام افراد کی ضروریات زندگی پورا کرنا- چونکہ اسلامی نظام کتاب اللہ کے قوانین و اقدار کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوتا ہے اس لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے- وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (7/170)- یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور اس طرح اقامت صلوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں-

**الصلوٰۃ اور معاشیات** صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہے' اسے قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں واضح کر دیا ہے- سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کے سامنے دعوت خداوندی کو پیش کیا تو حسب معمول انہوں نے اس کی مخالفت کی- شدید کشمکش کے بعد قوم نے حضرت شعیبؑ سے پوچھا کہ یہ تجویز کہ آپ بالاخر چاہتے کیا ہیں؟- آپ نے فرمایا کہ میں صلوٰۃ کی آزادی چاہتا ہوں (کہ اس میں آپ لوگ مخل نہ ہوں)- اس مذہب پرست قوم نے اپنے خیال کے مطابق سمجھا کہ یہ اپنے طریق پر خدا کی پرستش کی اجازت چاہتے ہیں- اس میں کون سی حرج کی بات ہے- یہ جس طرح جی چاہے پوجا پاٹ کر لیا کریں- چنانچہ وہ اس پر رضا مند ہو گئے- لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انہوں نے دیکھا کہ صلوٰۃ سے حضرت شعیبؑ کا مطلب وہ نہیں تھا جسے وہ سمجھے بیٹھے تھے- چنانچہ انہوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11/87)- اے شعیبؑ ! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں- اور یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں- اس صلوٰۃ کی تو ہم اجازت نہیں دے سکتے- آپ اس آیۃ جلیلہ کے آخری حصہ پر غور کیجئے جس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ صرف نماز کا نام نہیں- اس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہوتا ہے-

**صلوٰۃ اور معاشی نظام کا تعلق** ہم نے سورۃ حج کی آیت (22/41)- میں دیکھا ہے کہ کہا یہ گیا ہے کہ جماعت مومین کی اپنی مملکت قائم ہو گی تو وہ اقامت صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے- دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (29/45)- یہ حقیقت ہے کہ الصلوٰۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے- فحشاء کی تفصیلی

بحث تو آگے چل کر سامنے آئے گی۔ یہاں ہم اپنے آپ کو 'منکر' تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے نہی عن المنکر' مملکت کا فریضہ بتایا گیا اور یہاں یہ کہا گیا کہ یہ کام الصلوٰۃ کرے گی۔ یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوٰۃ اس نظام ہی کا نام ہے جس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ جہاں تک ہماری نمازوں کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ ان سے فحشاء اور منکرات نہیں رکتے۔ بے نمازوں کو تو چھوڑیئے' کتنے نمازی ہیں جو بڑی باقاعدگی سے نمازیں پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ منکرات کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا منکرات' نظام صلوٰۃ (اسلامی نظام مملکت) ہی سے رک سکتے ہیں۔ منکر کے بعد فحشاء کو لیجئے۔ لفظ فحشاء کا مادہ (ف۔ ح۔ ش) ہے جس میں ہر امر شنیع (قابل نفرت) آجاتا ہے۔ لیکن عربوں کے ہاں' جب فحش لفظ بولا جاتا تھا تو اس کے معنے عام طور پر بے حیائی کے لئے جاتے تھے لیکن فحشاء کے معنی بخل کے تھے کیونکہ ان کے ہاں بخل انتہائی درجہ کی قابل نفرت خصلت تھی۔ جہاں تک منکر کا تعلق ہے اس میں بھی ہر معیوب بات آجاتی ہے لیکن بنیادی طور پر اس کے معنے ہوتے ہیں عقل خود بین (یعنی صرف اپنا ہی مفاد سوچنے والی عقل) کی حیلہ جوئیاں اور فریب کاریاں۔ عقل کو اگر وحی سے آزاد کر دیا جائے تو اس کا منصب یہ رہ جاتا ہے کہ وہ انسان کو اس کے ہر فعل اور فیصلہ کے لئے جواز کی دلیلیں سمجھاتی اور سمجھاتی رہے۔ بنابریں الصلوٰۃ کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وہ انسان کے دل سے بخل کے جذبات نکال دیتی ہے اور عقل خود بین کو اس کے جواز کی دلیلیں گھڑنے کے راستے میں روک بن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ غائت کے اعتبار سے الصلوٰۃ اور معاشی نظام میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ بالفاظ دیگر صلوٰۃ کا عملی نتیجہ یہ ہو گا کہ معاشرہ سے ہر قسم کی بے حیائی ختم ہو جائے' اور افراد معاشرہ کے دل سے بخل کی تنگ نظری اور خود غرضی کے جذبات نکل جائیں اور ان کی جگہ وسعت قلب اور کشائش کے جذبات پیدا ہو جائیں جن کی رو سے زندگی کا مقصد اپنے مفاد کا حصول ہی نہ ہو بلکہ نوع انسان کی منفعت ہو۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ بقاء اسی عمل' اسی نظریہ' اسی نظام کے لئے ہے جس سے مقصود نوع انسان کی منفعت ہو (13/17)۔ صلوٰۃ کا نتیجہ اس قسم کا تغیر نفسی ہونا چاہئے۔

**تکذیب دین** سورۃ الماعون' (107) میں کہا گیا ہے: ارءیت الذی یکذب بالدین (107/1)۔ تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں جو دین کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ذکر ان کا ہے جو دین سے متمسک ہونے کے مدعی ہیں۔ (یعنی ہماری طرح اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں) لیکن عملاً دین کو جھٹلاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں جس سے دین کو جھٹلاتے ہیں۔ فرمایا:

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (107/2-3)۔ یہ وہ ہے کہ جو' اس شخص کو' جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے' دھکے دیتا ہے (لفظ یتیم میں وہ بچے بھی آجاتے ہیں جن کے

... باپ مر چکے ہوں اور وہ بھی جو معاشرہ میں تنہا ---- کسمپرسی کے عالم میں رہ جائیں)۔
ان لوگوں کو دھکے دینے کا مفہوم سورۃ الفجر کی ان آیت سے واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کی حالت یہ ہے کہ اگر اس پر رزق کی تنگی آجاتی ہے تو چلا اٹھتا ہے کہ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ (89/16)- دیکھئے! خدا نے مجھے یونہی ذلیل و خوار کر دیا- میں نے تو کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا- جس کی مجھے اس طرح سزا ملتی- کہا کہ یہ غلط ہے کہ ہمارے ہاں سے کسی پر ذلت و خواری کا عذاب یونہی مسلط کر دیا جاتا ہے- یہ تمہاری ذلت و خواری' تمہارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے- اور وہ اعمال یہ تھے : كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (89/17)- تم ان لوگوں کو مستحق تکریم و احترام نہیں سمجھا کرتے تھے- جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے- تمہارے نزدیک واجب التکریم وہی لوگ قرار پاتے تھے جن کا جتھہ (پارٹی) بڑا ہو- تمہارا دوسرا جرم یہ تھا وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (89/18)- جو لوگ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے (جن کی حرکت رک جاتی تھی)- تم ایسا انتظام نہیں کرتے تھے جس سے انہیں سامان زیست میسر آجائے- وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (89/19)- تم باپ دادا کی میراث خود ہی ہڑپ کر جاتے تھے- وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (89/20)- اور چاہتے یہ تھے کہ ساری دنیا کی دولت سمٹ سمٹا کر تمہارے پاس جمع ہو جائے-

اس کے بعد آپ پھر سورۃ الماعون کی طرف آجایئے جہاں کہا گیا ہے کہ تکذیب دین وہ کرتا ہے جو معاشرہ میں تنہا رہ جانے والوں کی عزت و تکریم کرنے کی بجائے انہیں دھکے دیتا ہے اور وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (107/3)- معذور لوگوں کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا- اس کے بعد ہے : فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (107/4)- یہ وہ مصلین (نمازی) ہیں جن کی نمازیں ان کے لئے تباہی کا موجب بن جاتی ہیں- اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107/5-7)- یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کی مرئی اور محسوس حرکات ہی کو صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی روح اور غرض و غایت کی طرف سے غفلت برتتے ہیں یعنی نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن رزق کے ان سرچشموں' جنہیں نوع انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے رواں دواں بہتے رہنا چاہیے تھا' کے سامنے بند لگا کر انہیں اپنے لئے روک لیتے ہیں- یہ ہیں وہ مصلین جن کی نماز ان پر تباہیاں لاتی ہے اور یہی ہیں وہ لوگ جو دین کی تکذیب کرتے ہیں-

سورۃ المدثر میں ہے کہ جہنم کے داروغے مجرمین سے پوچھیں گے کہ تم کون سے ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے تھے جن سے تم واصل جہنم ہو رہے ہو- قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (74/43-46)- وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم مصلیں میں سے نہیں تھے- ہم معذوروں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے- ہم ان امور کے متعلق باتیں تو بہت بنایا کرتے تھے لیکن عملاً کچھ نہیں کیا کرتے تھے- اور یوں ہم دین کی تکذیب کرتے تھے-

یہ تو دین کی تکذیب کرنے والے مصلیں

تھے۔ اس کے مقابلہ میں سورۃ المعارج میں قرآن کریم نے اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں کہا ہے کہ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰی (70/17)- جہنم آوازیں دے دے کر بلائے گی ان لوگوں کو جن کا شیوہ یہ تھا کہ جب انہیں دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بلایا جاتا تو وہ یا تو پیٹھ موڑ کر چل دیتے' اور اگر بات سن لیتے تو گریز کی راہیں نکالتے۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70/18)- یہ وہ لوگ تھے جو دولت جمع کرتے تھے اور اپنی تھیلیوں کا منہ کس کر بند کر لیتے تھے۔ اس کے بعد کہا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ○ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ○ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ○ (70/19-21)- حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر وحی کی اقدار سے بے نیاز ہو جائے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا وہ بڑا بے صبرا بن جاتا ہے۔ ایسا بے صبرا کہ ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب خوش حالی آتی ہے تو مال و دولت کو روک کر رکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد کہا : اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ○ (70/22)- لیکن مصلین ایسے نہیں ہوتے۔ یعنی وہ لوگ جو الصلوٰۃ کی التزاما" پابندی کرتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ○ (70/23-26)- یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے مال و دولت میں ان لوگوں کا حق ہے۔ جن کی ضروریات ان کی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتیں یا وہ بالکل معذور ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان آیات میں "حق معلوم" کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ یعنی سائل و محروم' نہ تو ان سے خیرات مانگتے ہیں نہ یہ انہیں بطور خیرات کچھ دیتے ہیں۔ یہ دونوں جانتے ہیں کہ ان کے مال میں ہر ضرورت مند کا حق ہے۔ وہ اسے بطور استحقاق (As Of Right) طلب کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نظام انفرادی زکوٰۃ اور خیرات کا نہیں۔ یہ وہ نظام ہے جس کا فریضہ تمام افراد انسانیہ کی ربوبیت ہے۔ اس نظام میں ہر ضرورت مند کو سامان زیست اس کے حق کے طور پر ملتا ہے۔ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے۔ اور یہ اقامت صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ ہے۔

ہم اوپر (سورۃ الماعون میں) دیکھ چکے ہیں کہ تکذیب دین کرنے والے وہ لوگ ہیں جو نماز کی محسوس اور مرئی حرکات (رکوع و سجود وغیرہ) ہی کو الصلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں۔ اور اس کی روح' مقصد اور غرض و غایت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سورۃ نساء میں ان لوگوں کو منافقین کہا گیا اور ان کی حالت یہ بتائی گئی ہے کہ :

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ (4/142)- جب وہ الصلوٰۃ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسالی کی کیفیت لئے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ ان حرکات و سکنات کی ادائیگی سے سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ پورا ہو گیا۔ وہ حرکات و سکنات' جنہیں لوگ دیکھ سکیں اور اس طرح ان کی تعریف کریں کہ یہ بڑے پکے نمازی ہیں۔ اس آیت میں لفظ کسالی میں ایک لطیف نکتہ مضمر ہے۔ روئی دھننے والے کے پاس دھنک ہوتی ہے جس میں کمان کے ساتھ تانت لگی ہوتی

[illegible] کے صحیح ہونے سے روئی دھنکنے کا [illegible] ہوتا ہے۔ لیکن اگر تانت اور کمان کو [illegible] کر دیا جائے تو یہ مقصد کبھی حاصل [illegible] سکے۔ "الکس" اس تانت کو کہتے ہیں جو [illegible] سے الگ کر دی گئی ہو۔ آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ وہ صلوٰۃ جس میں اس کی محسوس حرکات سے اس کے مقصد و غایت کو الگ کر دیا جائے، میزان خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہے۔

سورۃ التوبہ میں منافقین کی یہ کیفیت بتائی گئی ہے: وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (9/54)- وہ صلوٰۃ کی طرف آتے ہیں تو کسالی کی کیفیت لئے ہوئے اور اگر دین کی خاطر کچھ دیتے ہیں تو بیگار سمجھتے ہوئے!

ان آیات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ قرآن کی رو سے صلوٰۃ اور نظام معیشت کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اور جس صلوٰۃ سے معاشی نظام کو الگ کر دیا جائے یا جس معاشی نظام کو نظام صلوٰۃ سے جدا کر دیا جائے، قرآن کریم کی رو سے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

## صرف حرکات و سکنات صلوٰۃ نہیں

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اگر صلوٰۃ کی غرض و غایت پیش نظر نہ ہو اور صرف نماز کی حرکات و سکنات (ارکان) کو صلوٰۃ سمجھ لیا جائے تو قران اسے صلوٰۃ تسلیم نہیں کرتا۔ اس فرق کو اس نے سورۃ بقرہ کی آیت (ص 177) میں بڑی وضاحت سے [illegible] کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ- نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ- نیکی اس کی ہے جو اللہ- آخرت- ملائکہ- کتب اور انبیاء پر ایمان لائے- اور اس کے بعد وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ- مال کی محبت کے علی الرغم اسے ضرورت مند اقرباء- یتاماء- مساکین- مسافروں- محتاجوں کو دے- اور انہیں دے جو انسانوں کی محکومیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں- اس کے بعد ہے وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ .... (الخ) اور وہ اس طرح اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں- آپ نے غور فرمایا کہ اقامت صلوٰۃ سے کیا مفہوم ہے اور ایتائے زکوٰۃ سے کیا مقصود؟ اقامت صلوٰۃ کا مفہوم ہے ایمان کے بعد اپنی دولت کو ضرورت مندوں اور محتاجوں کے لئے کھلا رکھنا- اور ایتائے زکوٰۃ سے مراد ہے افراد معاشرہ کو سامان نشوونما مہیا کرنا۔

اور اس کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ آپ صلوٰۃ (نماز) میں کہیں اس کے معنی اور مطلب آپ کو معلوم ہو- ارشاد خداوندی ہے- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4/43)- "اے ایمان والو! جب تم مدہوشی کی حالت میں ہو تو اجتماعات صلوٰۃ میں شریک نہ ہو- ان میں اس وقت شریک ہو جب تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو"- اس میں ذکر تو بالخصوص حالت مدہوشی کا ہے

تیسرا اصول یہ ہے کہ صلوٰۃ اس طرح ادا کرو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو تمہیں اس کے معانی اور مطلب معلوم ہو۔ جن الفاظ کے معانی معلوم نہ ہوں ان کے دہرانے سے فائدہ کیا ہے؟ (لیکن ہمارے ہاں تو پورے کے پورے قرآن کے الفاظ بلا سوچے سمجھے دہرائے جاتے ہیں۔ صلوٰۃ کا ذکر کیا؟)۔

بہرحال آیت (2/177)۔ سے واضح ہے کہ صلوٰۃ سے مقصود ظاہراً ارکان کی ادائیگی ہی نہیں۔ اس کا مقصد محتاجوں اور مسکینوں، کی ضروریات زندگی بہم پہنچانا ہے۔ بالفاظ دیگر صلوٰۃ انسان کو اس ایثار کے لئے آمادہ کر دیتی ہے۔ اگر صلوٰۃ کا نتیجہ یہ نہیں تو وہ محض میکانکی عمل ہے۔

**نماز** اگرچہ قرآن کریم کی رو سے اقامت صلوٰۃ کا مفہوم وہ نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں، اور کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ (صلوٰۃ) اس شکل کے لئے بھی آیا ہے جسے نماز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ نماز قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا لفظ ہے۔ ایران کے مجوس (جنہیں ہمارے ہاں پارسی کہا جاتا ہے) اپنے طریق پرستش کو نماز کہا کرتے تھے۔ انہی کے ہاں سے یہ لفظ ہمارے ہاں (ہند و پاک) میں آیا اور ایسا عام ہوا کہ اب صلوٰۃ کی جگہ یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، حالانکہ قرآن کریم میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ بایں ہمہ، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، الصلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں اب نماز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

اسلامی نظام کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (42/38)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو احکام خداوندی کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں امور مملکت باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں اور اس پر غور و فکر کرتے ہیں کہ فریضہ انفاق کی ادائیگی کے لئے کس قسم کی تدابیر اختیار کی جائیں"۔ صدر اول کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب مملکت کے کسی اہم معاملہ کے لئے مشاورت کی ضرورت لاحق ہوتی تو حکومت کی طرف سے ان الفاظ میں منادی کرائی جاتی کہ الصلوة الجامعة۔ اس پر لوگ اس اجتماع میں شرکت کے لئے جمع ہو جاتے۔ چونکہ مشاورت کی غایت، قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرنا تھا اس لئے اس کی ابتدا، نماز کی شکل میں ہوتی۔ (جس طرح اب ہمارے ہاں رسمی طور پر جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جاتا ہے) اس سے ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات وقت مقررہ پر ہوتے تھے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ : اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4/103)۔ یاد رکھو! صلوٰۃ، مومنین کے لئے ایک موقت فریضہ ہے۔ یعنی ایسا فریضہ جس کی وقت معین پر ادائیگی کی جائے گی۔ بالفاظ دیگر جو وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو اس وقت اس اجتماع میں شرکت لازمی ہو گی۔

ان اجتماعات کے لئے یہی وہ بلاوا ہے جسے

قرآن نے ندائے صلٰوۃ (اذان) سے تعبیر کیا ہے۔ سورۃ جمعہ میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (62/9)- اے افراد جماعت مومنین! جب یوم الجمعہ کو صلٰوۃ کے لئے آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر مقام اجتماع کی طرف لپک کر آجایا کرو کیونکہ وہاں "اللہ کی باتیں" ہوں گی۔ دوسری جگہ ہے وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا (5/58)- مخالفین کی حالت یہ ہے کہ جب تم الصلٰوۃ جیسے اجتماع کے لئے منادی کرتے ہو تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ صلٰوۃ کے بعد مسجد میں جملہ معاملات طے ہوتے تھے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب وصیت کے معاملہ میں کوئی متنازعہ فیہ امر فیصلہ طلب ہو تو صلٰوۃ کے بعد متعلقہ پارٹیوں کو وہاں روک لیا کرو تاکہ اس معاملہ کا قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے (5/1-6)

جس شکل میں نماز پڑھی جاتی ہے اس کی جزئیات قرآن کریم میں نہیں آئیں۔ صرف ایک (مثلاً قیام- رکوع- سجدہ) کا اجمالی طور پر ذکر قران میں آیا ہے۔ ان جزئیات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں حضور نبی اکرمؐ نے مقرر فرمایا تھا۔ چشم ما روشن' دل ماشاد۔ لیکن اس سے سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ یہ ظاہر ہے کہ امت میں کئی فرقے ہیں اور ایک فرقہ کی نماز کی جزئیات اور دوسرے فرقے کی نماز کی جزئیات میں فرق اور اختلاف ہے۔ یہ اختلاف اس قدر شدید ہے کہ اس کی بحث و مناظرہ ہی نہیں' دنگا فساد تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ پولیس اور عدالت تک۔ اس کے باوجود ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی نماز وہی ہے جو حضور نبی اکرمؐ نے ادا فرمائی تھی۔

حضور نبی اکرمؐ ساری عمر نماز ادا فرماتے رہے۔ تنہا نہیں' سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ کی موجودگی میں۔ ان سب نے اسی طرح نماز ادا کی جس طرح انہوں نے حضورؐ کو ادا کرتے دیکھا تھا۔ (ایک حدیث بھی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم اسی طرح نماز ادا کرو جس طرح مجھے ادا کرتے دیکھتے ہو)۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نمازوں میں اختلاف کب پیدا ہوا اور کس طرح پیدا ہوا؟ اور پیدا بھی اس طرح ہوا کہ اس کے مٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں! اب متعین طور پر فیصلہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ نے نماز کس شکل میں ادا فرمائی تھی۔

**موجودہ نماز تفرقہ کی مظہر ہے** قرآن کریم نے الصلٰوۃ کو امت میں وحدت پیدا کرنے اور قائم رکھنے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اس نے سورۃ روم میں کہا کہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30/31-32)- تم صلٰوۃ قائم کرنا اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا' فرقوں میں بٹ گئے اور پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ یہ سمجھنے لگ گیا کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ گویا قرآن کریم نے صلٰوۃ کو امت میں وحدت پیدا

کرنے اور وحدت برقرار رکھنے کا ذریعہ بتایا تھا اور تفرقہ کو شرک۔ لیکن وائے بد نصیبی کہ اب وہی صلوٰۃ (نماز کی شکل میں) امت کے تفرقہ کا مظہر قرار پا گئی ہے۔ کسی جلسہ میں دس ہزار مسلمان بیٹھے ہوں ان میں فرقہ بندی کی کوئی محسوس علامت سامنے نہیں آئے گی' سب ایک امت کے افراد دکھائی دیں گے لیکن اس دوران میں اگر نماز کی اذان سنائی دے تو ان میں سے ایک ٹولی ایک مسجد کا رخ کرے گی دوسری ٹولی دوسری مسجد کا۔ اور اس طرح ان کے گروہ مندانہ اختلافات ابھر کر سامنے آجائیں گے اور ان اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہو گا کہ ایک فرقہ سے متعلق مسلمان کو دوسرے فرقہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اگر وہ بھولے بھٹکے دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز پڑھ لے گا تو دہائی مچ جائے گی کہ اس کی نماز نہیں ہوئی۔ اس تفرقہ سے وہ لوگ بچیں گے جو نماز پڑھنے نہیں جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جتنی کثرت سے لوگ نماز پڑھیں گے اتنی کثرت سے امت کے اختلافات ابھر کر نمایاں ہو جائیں گے۔

کچھ عرصہ پہلے دفاتر میں نماز پڑھنے کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے برسوں سے دفتر کے اہل کار بلا اختلاف اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ نماز باجماعت کی تحریک شروع ہوئی تو ایک ہی دفتر میں نہیں بلکہ ایک ہی کمرے میں' شیعہ۔ سنی۔ وہابی۔ دیو بندی۔ بریلوی کے گروہ الگ الگ ہو گئے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ (مولانا) نورانی نے صدر مملکت سے کہا تھا کہ وہ (اور تو اور) مسجد الحرام میں امام کعبہ کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے۔

قرآن مجید میں صرف ایک مسجد کا ذکر ہے جو تفرقہ کا موجب تھی۔ اسے مسجد ضرار کہہ کر پکارا گیا اور کفر کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ اور خدا اور رسول کے دشمنوں کی آماجگاہ۔ یہ اس لئے کہ وہ تفریق بین المومنین کا موجب تھی (9/107)... رسولؐ اللہ سے کہا گیا کہ آپ اس میں قدم تک نہ رکھیں۔ تاریخ بتاتی ہے اسے آپؐ نے مسمار کرا دیا حالانکہ اس کے بنانے والے قسمیں کھاتے رہے کہ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰی (9/107)۔ ہماری نیت بڑی نیک تھی۔ اب ہماری ہر مسجد تفریقاً" بین المومنین کا موجب اور مظہر ہے۔

---

آج سے کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے کہا کہ یہ تمام اختلافات احادیث کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم قرآن سے نماز کی جزئیات متعین کریں گے۔ یعنی اس قرآن سے جس میں یہ جزئیات ہیں ہی نہیں۔

**فرقہ اہل قرآن** اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ اس فرقہ کے بانی (مولانا) عبداللہ چکڑالوی تھے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن کی رو سے پانچ وقت کی نماز۔ ہر نماز میں دو' تین' چار رکعتیں' اور ہر رکعت میں دو سجدے ہیں۔ ان کے مقتدی۔ لاہوری فرقے نے کہا کہ یہ صحیح نہیں۔ قرآن کی رو سے' تین وقت کی نماز۔ ہر نماز کی دو رکعتیں اور ہر رکعت میں ایک سجدہ ہے اور اسی قسم کے اختلافات اور بھی۔ یعنی

قرآن اس اعتراض سے بچا ہوا تھا کہ اس میں اختلافات نہیں۔ انہوں نے اسے بھی نہ چھوڑا۔

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکہ لگا کے چھوڑا

میں نے ان کے اس نظریہ اور مسلک کی شدت سے تردید کی اور "فرقہ اہل قرآن کی گمراہیاں" کے عنوان سے ایک مفصل پمفلٹ میں ان کے دلائل کا ابطال کیا۔ (طرفہ تماشا ملاحظہ ہو کہ ہمارے مولانا صاحبان خود مجھے "اہل قرآن" کہتے ہیں ! یا للعجب !!)

سوال ابھرے گا کہ امت میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں' وہ مٹ کس طرح سے سکتے ہیں؟ ان کا مٹنا اس لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رو سے' امت میں اختلاف خدا کا عذاب ہے (3/104)- اور تفرقہ شرک (30/31)- خدا نے اس امت کو امت واحدہ بنایا تھا۔ اس لئے جب تک اس امت میں اختلافات تفرقہ۔ فرقے باقی ہیں' یہ امت' امت مسلمہ نہیں قرار پا سکتی۔ صرف مسلمان نام رکھنے والی قوم ہی بن سکتی ہے۔ اور جب تک یہ قوم امت مسلمہ نہیں بنتی' نہ انکی مملکت' اسلامی مملکت ہو سکتی ہے۔ نہ ان کے اعمال و ارکان اسلام کا مقصد پورا کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہم مسلمانوں جیسا نام رکھ لینے سے حقیقی مسلمان نہیں بن جاتے' اسی طرح ارکان اسلام (نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ) کی شکلیں قائم رکھنے سے' یہ اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتے جس کے لئے انہیں خدا نے متعین کیا تھا۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی جب کہا تھا

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل' وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں' تو باقی نہیں ہے

بالفاظ دیگر :-

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اسلامی مملکت کا اولیں فریضہ امت کے اختلافات مٹانا اور انہیں اسلامی ارکان کے ظواہر کی روح سے آشنا کرانا اور ان کا مقصد بروئے کار لانا ہو گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں دو ایک مغالطوں کا دور کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہیں پیدا کر کے' پراپیگنڈہ کی مہم تیز کی جاتی ہے۔ میں جب اسلامی مملکت یا اسلامی حکومت کہتا ہوں تو اس سے مراد ہوتی ہے خلافت علیٰ منہاج رسالت۔ یعنی وہی مملکت جیسی عہد رسالتمآبؐ اور زمانہ خلافت راشدہ میں قائم ہوئی تھی جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا جملہ کاروبار کتاب اللہ کے مطابق سرانجام پاتا تھا۔ اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی کے لئے میں نے "مرکز ملت" کی اصطلاح اختیار کی تھی۔ وہ اتھارٹی (جسے اب سربراہ مملکت کہا جاتا ہے)۔ مرکز (Centre) تھی اور امت محیط جس کا ہر نقطہ مرکز سے یکساں فاصلہ پر تھا' اور وہ اس وقت تک قائم تھی جب تک مرکز قائم تھا۔ اسلامی نظام کے لئے (میرے نزدیک) یہ نہایت برجستہ اور تامہ تشبیہ تھی۔ قرآن کریم کی روشنی

میں اس مرکز کا ہر فیصلہ حرف آخر قرار پاتا تھا۔

مغالطہ آفرینی اور افترا پردازی کی رو سے' میرے خلاف کہا یہ گیا کہ میں پاکستان کی مختلف حکومتوں کے سربراہوں کو "مرکز ملت" قرار دیتا ہوں۔ استغفراللہ۔ جو شخص ان حکومتوں کو اسلامی تسلیم نہیں کرتا' وہ ان کے سربراہوں کو' اسلامی نقطہ نگاہ سے مرکز ملت کیسے کہے گا؟ انہیں ملت سے کیا واسطہ اور اسلام سے کیا تعلق۔

جب میں کہتا ہوں کہ امت کے اختلافات اسلامی نظام' یا اسلامی مملکت مٹائینگی تو اس سے مراد قرآنی مملکت یا نظام ہوتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس انداز کی حکومت یا نظام کو ایک بار پھر قائم ہونا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دین خداوندی (قرآنی نظام) کو تمام ادیان (انسانیت ساز نظاموں) پر آخرالامر غالب آنا ہے۔ اور وہ اسی صورت میں غالب آئے گا کہ اس انداز کی مملکت قائم ہو۔ امت کے اختلافات یہ مملکت دور کرے گی۔

امت کے اختلافات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (i) عقائد میں اختلافات (ii) اور ارکان اسلام (نماز روزہ وغیرہ) کی ادائیگی میں اختلافات۔ عقائد کے اختلافات دور کرنے کا طریق یہ ہو گا کہ انہیں قران کی روشنی میں پرکھ لیا جائے۔ جو اس کے مطابق ہوں انہیں رکھ لیا جائے جو اس کے خلاف ہوں انہیں مسترد کر دیا جائے۔

جہاں تک ارکان اسلام کا تعلق ہے' ان کا حکم تو قرآن کریم میں موجود ہے لیکن ان کی جزئیات (بہ تمام و کمال) قرآن میں موجود نہیں۔ (مثلاً صلوٰۃ۔ یعنی مروجہ نماز کو لیجئے) جیسا کہ پہلے بتایا یا چکا ہے۔ یہ جزئیات قرآن میں نہیں اور ان میں ہر فرقہ کا اختلاف ہے۔ اور ہر فرقہ کا دعویٰ کہ اس کی نماز۔ رسولؐ اللہ کی نماز جیسی ہے۔ اس کی تائید میں وہ احادیث پیش کر دیتا ہے۔ ہر فرقہ ایسا ہی کہتا ہے ان حالات میں' اس نظام کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہو گا کہ وہ حتمی اور یقینی طور پر طے کر سکے کہ مروجہ فرقوں کی نمازوں میں سے کون سی نماز رسولؐ اللہ کی نماز جیسی ہے۔ یہ دقت نماز ہی میں نہیں۔ باقی ارکان اسلام کی جزئیات میں بھی پیش آئے گی۔

اب صورت یہ پیدا ہوئی کہ

1- ان اختلافات کے مٹائے بغیر' امت' امت مسلمہ نہیں بن سکتی۔ اور

2- یہ اختلافات' موجودہ ذرائع (احادیث اور فقہ) کی رو سے مٹ نہیں سکتے۔ تو پھر اسلامی نظام کرے گا کیا؟

میری قرآنی بصیرت اس طرف راہنمائی کرتی ہے کہ قرآن کریم نے امت یا اسلامی مملکت کے متعلق جو کہا ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے تو یہ ان معاملات کے متعلق ہے جن کا اصولی حکم تو قرآن کریم میں دیا گیا ہے لیکن ان کی جزئیات اس نے خود متعین نہیں کیں۔ ان جزئیات کا تعین اسلامی نظام' امت کے مشورہ سے کرے گا۔ اس کا فیصلہ قول فیصل ہو گا جس کا اطلاق ساری امت پر یکساں ہو گا۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ (اس وقت) ہر فرقہ اس طریق کی مخالفت کریگا۔ اس لئے کہ کوئی فرقہ بھی اپنے طریق کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو

گا۔ ان سے یہی کہا جائے گا کہ اس کے سوا کوئی اور طریق ایسا ہو جس سے یہ اختلافات مٹ سکیں' تو آپ اسے تجویز فرما دیجئے۔ ان میں سے ہر فرقہ یہی کہے گا کہ ان کے طریق کو تمام فرقوں پر مسلط کر دیا جائے تو اختلافات مٹ جائیں گے؟ یہ کہتے وقت اسے فراموش نہ کیجئے کہ ایسا ہر فرقہ کہے گا تو کیا اس سے اختلافات مٹ جائیں گے؟

لیکن جب تک ایسا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت جیسا قرآنی نظام) قائم نہیں ہو جاتا ہر فرقہ اپنے اپنے طریق پر ان ارکان کو ادا کرتا رہے لیکن اس میں اس قسم کی شدت پیدا نہ کی جائے جس سے سر پھٹول تک نوبت پہنچ جائے۔ نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دی جائے کہ مروجہ طریقوں میں کسی قسم کا رد و بدل کرے۔ یا (اہل قرآن کی طرح) کوئی نیا طریق وضع اور اختیار کرے۔ اس سے امت میں مزید انتشار پیدا ہو جائیگا۔ میرا یہی مسلک ہے۔

---

میں نے اوپر کہا ہے کہ اس وقت ارکان اسلام کی صرف ظاہرا شکل باقی ہے۔ ان کی روح باقی نہیں جس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے تھے جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ رہ گئی رسم ... روح بلالی نہ رہی۔ میرا مسلک یہ ہے کہ جب تک اسلامی مملکت قائم نہیں ہوتی ان ظواہر کو اسی طرح باقی رکھا جائے۔ ایک تو اس لئے کہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں ہمارے قومی تشخص کا ذریعہ ہیں۔ جس قسم کے بھی ہم ہیں' ان سے ... ہماری پہچان ہو جاتی ہے' جس طرح ہمارے نام سے' غیر مسلموں سے ہمارا امتیاز ہو جاتا ہے حالانکہ وہ صرف نام ہی ہوتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ جب کبھی اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آئے گا ان بے روح پیکروں میں قرآنی روح پھونکنا آسان ہو گا۔ ہمیں تاسیس کی ضرورت نہیں پڑیگی۔ اقبال نے جب کہا تھا کہ۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

تو اس میں مندرجہ بالا دونوں مقاصد شامل تھے۔

لیکن ان ظواہر سے متمسک ہونے سے اگر ہم سمجھ لیں کہ ان کی ادائیگی سے منشاء خداوندی پورا ہو جاتا ہے تو یہ بہت بڑی خود فریبی ہو گی۔ ظواہر کی شکلوں کی پابندی یا ارکان اسلام پر میکانکی طور پر عمل پیرا ہونے سے' ان کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا' اس طرح ایک صف میں کھڑے ہونے کے باوجود' محمود' محمود رہتا ہے اور ایاز' ایاز۔ حقیقی صلٰوۃ میں نہ محمود' محمود رہے گا نہ ایاز' ایاز۔ دونوں خدا کے عبد اور یکساں تکریم انسانیت کے مستحق ہوں گے۔ صدر اول میں امت نے رفعت اور بلندیوں کے جو بے مثال مقامات حاصل کئے تھے تو ان ارکان کے ظواہر کی پابندی سے نہیں۔ ان کی گہرائیوں میں ڈوب کر کئے تھے۔ اس وقت عمر ابن خطاب' بلالؓ حبشی" کو سیدنا بلال کہہ کر سلام کرتا تھا۔ اور چشم فلک نے یہ جنت بدوش نظارہ دیکھا تھا کہ

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہ ہے قرآنی صلٰوۃ جو تکریم انسانیت کا واحد اور منفرد ذریعہ ہے۔

غلام احمد پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشیر احمد عابد (کویت)

# موت کا ایک دن معین ہے؟

محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب قرآن کریم کے نہایت لائق و فائق طالب علم ہیں۔ ہماری نگاہ میں آپ جماعت اہل علم و نظر میں ایک بلند پایہ محقق اور راسخ فی العلم عالم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طلوع اسلام کے گذشتہ شمارے میں آپ نے عنوان بالا پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ کے مضامین طلوع اسلام میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور ہمارے لئے وجہ تسکین خاطر بنتے ہیں۔ چونکہ آپ کی تربیت سائنٹیفک ماحول میں ہوئی ہے (مولویانہ ماحول میں نہیں) لہٰذا آپ کا طرز استدلال از حد بلیغ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ آپ نے قرآن اور سائنس کے موضوع پر جو کتب تصنیف کی ہیں وہ ہمارے اسلامی لٹریچر میں بے مثال حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کی مباحث زیادہ تر حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ آپ نے عقائد، نظریات اور فلسفیانہ موشگافیوں سے ہمیشہ احتراز برتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو وادی تخیل میں گھوڑے دوڑاتے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ آپ کی بیشتر تحریریں دو جمع دو برابر چار کے مصداق حتمی اور غیر مبہم ہوتی ہیں۔ یہ انداز تحریر، قرآن کریم کے ہر طالب علم کا خاصہ ہے۔ قرآن کریم خود بھی سادہ اور سلیس ہے اور اپنے پڑھنے والوں کے پیچ و خم بھی درست کر دیتا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے:

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ۔ (39:28)

"قرآن کو صاف اور غیر مبہم زبان (عربی) میں نازل کیا ہے۔ اس میں کسی قسم کا پیچ و خم۔ ابہام و ایہام نہیں"۔

یہ چیز اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ایسا ضابطہ حیات منضبط کر سکے جو اس کے اختلافات اور تفرقات کو مٹا کر باہمی اخوت اور وحدت کا موجب بن سکے۔ آج دنیا میں جو فکری انتشار و افتراق اور باہمی تصادمات و تزاحمات کا طوفان برپا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی اکثریت قرآن کریم کی حاکمیت کی انکاری ہے۔ اور تو اور خود مسلمان بھی قرآن کریم کی خالص تعلیمات کے پیروکار نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ پوری ملت اسلامیہ فرقوں اور جغرافیائی خطوں میں بٹی ہے۔ ان کے مابین کسی ایک معاملے میں بھی متفق الخیالی اور فکری ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ہر فرقے کا اپنا الگ مسلک و مشرب و مذہب ہے اور ہر قوم کا اپنا دستور و آئین ہے۔ توحید، آخرت، نبوت، کتاب حتیٰ کے مسلمان ہونے کا تصور الگ الگ ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم کے اصول و احکام نہایت واضح اور ریب و تشکیک سے مبرا ہیں۔ ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں پایا جاتا اور ان میں وحدت انسانیہ پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود اس کی آیات میں کوئی ابہام یا اختلاف پایا جائے تو اسے ہم

ہم انسانی کا نقص اور عقل و شعور کی ناپختگی سمجھیں گے یا پھر یہ علمی فتور اور استکبار کا نتیجہ ہو گا۔ مؤخر الذکر صورت حال کا تو کوئی علاج نہیں بجز اس کے کہ یہ اختلاف تباہی بن کر نمودار ہو جائے۔ البتہ اول الذکر صورت میں جو اختلاف پیدا ہوتا ہے اسے مٹانے کے لئے قرآن کریم کی واضح رہنمائی موجود ہے۔ ایسی صورت حال میں قرآن مسلمانوں کو تدبر فی القرآن کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق سے متعلق کبھی دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایسا ناممکن ہے جیسے سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ اور یہ دلیل اس قدر مسکت و محکم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لئے بطور شہادت پیش کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ النساء کی آیت نمبر 82) قرآن کریم کی آیات میں اختلاف' تدبر کی کمی یا نقص کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ جب بھی اختلافی امور سامنے آئیں انہیں فکر و تدبر سے سمجھایا جائے۔ غور و فکر کا تقاضا خود لفظ تدبر کے بنیادی معنی میں شامل ہے۔ تدبر کا مادہ (د۔ب۔ر) ہے جس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا آخری اور پچھلا حصہ۔ علمی طور پر اس کا مفہوم ہے کہ کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا۔ یہ غور و فکر اس وقت تک جاری رہنا چاہئے جب تک کہ معاملات پیش نظر سلجھ نہ جائیں اور حقائق واضح نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی آیات بڑی با برکت ہیں۔ ان پر جس قدر غور و خوض کیا جائے ان سے اتنی ہی زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور انسان کے قلب و نگاہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں موت و حیات کے مسئلہ پر قرآن کریم کے حوالے سے بحث کی ہے۔ موت و حیات کا مسئلہ روز ازل سے انسانی فکر کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے۔ اس مسئلہ پر بہت غور و خوض ہوا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے علماء اور دانش وروں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن آج تک کوئی حتمی نتیجہ سامنے نہیں آسکا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے' ڈاکٹر صاحب خود بھی ایک بلند پایہ عالم اور محقق ہیں۔ یقیناً' آپ نے اس موضوع پر جو کچھ کہا وہ آپ کے گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہو گا۔ لیکن اس سے اختلاف کرنا قطعی تعجب انگیز نہیں ہو گا۔ آپ فرماتے ہیں:

"استاد محترم پرویزؒ مرحوم کے ساتھ قرآنی آیات پر میری گفتگو جاری رہتی تھی۔ اس میں یہ دلچسپ مسئلہ بھی زیر بحث آیا کرتا تھا کہ آیا انسانی موت صرف سبب و مسبب (Cause and Effect) کا مسئلہ ہے یا اس کے علاوہ بھی اس پر اللہ تعالیٰ کا براہ راست کنٹرول ہے۔ آیت زیر بحث (3:144) ہوتی تھی:

(وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔ کسی شخص میں یہ طاقت نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے۔ اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے)۔

پرویز مرحوم کا نظریہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کا بڑھنا یا گھٹنا (Cause and Effect) کا مسئلہ ہے۔ کون کتنی عمر جیتا ہے اور کس کی عمر میں کمی آجاتی ہے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ قانون طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر قانون طبعی کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو عمر بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو عمر گھٹ جاتی ہے۔ لیکن میرا نظریہ قدرے مختلف تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ درست ہے کہ زندگی کی مدت کا انحصار طبعی قوانین کے مطابق زندگی گذارنے پر ہے لیکن یہ نظریہ حادثاتی موت پر لاگو نہیں ہوتا

اور اپنے نظریے کی تائید میں خود اپنی گذشتہ زندگی کے واقعات پیش کرتا تھا۔ اور وہ یہ تھے:۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کے جو واقعات پیش کئے ہیں۔ ان کا جائزہ ہم ذرا آگے چل کر لیں گے پہلے اس مقدمہ کو لیتے ہیں جس میں ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ حادثاتی موت اللہ تعالیٰ کے براہ راست کنٹرول میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کائنات علل و اسباب کے ایک لامتناہی سلسلے میں بندھی ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے جن اشیاء کو دیکھتے ہیں اور ہماری نگاہوں کے سامنے جو حادثات و واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ دراصل علل و اسباب کے اسی لامتناہی سلسلے کی ایک کڑی ہوتے ہیں۔ ہم ان کی ماضی اور مستقبل کی اشکال کا احاطہ ایک حد سے آگے نہیں کر سکتے۔ یہ انسان کی قوت ادراک اور قوت تخیل کا ایک بہت بڑا نقص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بھی واقعہ یا شے کے متعلق حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے کہ اس کا آغاز کیسے ہوا اور اس کا انجام کیا ہو گا؟ اشیائے کائنات کا علم کلی صرف خدا کو ہے۔ ہمارے علم کا انحصار تجربہ اور مشاہدہ پر ہے یا پھر ایمان! اس سے ماوراء اور ہٹ کر جو کچھ ہوتا ہے وہ تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے یا پھر ظن! ہمارا تجربہ اور مشاہدہ جس قدر وسیع اور پختہ ہوتا ہے ہم اسی نسبت سے اشیائے کائنات سے متعلق حتمی طور پر اپنی رائے قائم کرنے کے قابل ہوتے ہیں یا پھر قرآن کا علم ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

علوم جدیدہ میں جو مسائل تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ہیں ان کو سائنس کہا جاتا ہے اور جو مسائل تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے باہر ہیں ان کا نام فلسفہ رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم نے ان علوم کو اپنی اصطلاح میں محکمات اور متشابہات سے تعبیر کیا ہے۔ انسان کا علم جوں جوں ترقی کرتا ہے اسی نسبت سے متشابہات محکمات کا درجہ اختیار کرتی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان کی تخصیص نہیں کی ہے۔ کائنات کے رموز و اسرار سے آئے دن پردے اٹھ رہے ہیں اور انسانی تہذیب و تمدن اور معاش و معاشرت کے نت نئے گوشے سامنے آرہے ہیں۔ ہر شے کی نشوونما اور ارتقاء کے تقاضے بدل رہے ہیں اور بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کے ارتقاء پذیر نظام عالم میں جامد اور ساکت نظریات و نتائج کا وجود ناممکن ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عالم کا تمام نظام قوانین فطرت کا مرہون ہے۔ لیکن یہ قوانین مستقل بالذات یا ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں ہیں بلکہ سب ایک دوسرے کے موافق، متناسب اور معین ہیں۔ ان میں نہایت گہرا باہمی ربط و تناسب پایا جاتا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی چھوٹی چیز کو پیدا کرنے میں کئی قوانین فطرت باہم مل کر کام کرتے ہیں۔ ایک کمزور سے کمزور گھاس اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب مٹی، ہوا، پانی وغیرہ سے لیکر بڑے بڑے اجرام فلکی مثلاً سورج، چاند، ستارے وغیرہ کے افعال و خواص اس کے پیدا کرنے میں مشارکت اور توافق کو عمل میں لائیں۔ اس باہمی مشارکت اور توافق کی یہ کیفیت ہے کہ ان قوانین میں سے ایک بھی اگر مرکز سے ذرا ہٹ جائے تو تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو یوں بیان فرمایا ہے:

**اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ۔**

"اس نے فضا کی پہنائیوں میں مختلف کروں کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے

ہے۔ تم دیکھو گے تمہیں خدائے رحمٰن کی تخلیق
کی کائنات میں بے ترتیبی یا عدم تناسب نظر
نہیں آئے گا۔ تم ایک بار نہیں بار بار نگاہ کو لوٹا کر
دیکھو تمہیں کوئی شے بے جوڑ یا انمل دکھائی نہیں
دے گی۔ "(67:3)

یہ حقیقت ہے کہ انسان جس قدر حقائق اشیاء سے ناواقف ہوتا ہے اسی نسبت سے علل و اسباب کے سلسلہ پر اس کی نظر کم پڑتی ہے اور وہ ہر چیز کو براہ راست خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ایک دہقان کا بچہ برسات کے زمانہ میں جب بادلوں کو آتے دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے کہ "اللہ میاں آئے" یعنی بادلوں کا آنا خدا کا آنا ہے۔ اس حالت سے جب ترقی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ:

"اللہ میاں کے حکم سے پانی برسا" اب اس نے خدا اور پانی میں بادل کو واسطہ قرار دیا۔ اس درجہ کے بعد یہ بحث پیدا ہوتی ہے۔ کہ بادل براہ راست خدا کے حکم سے پیدا ہو گئے یا خدا نے ان کو بھی کسی اور علت کے ذریعے پیدا کیا۔ ٹھیٹھ مذہبی آدمی خیال کرتا ہے کہ بادل اور خدا میں کوئی درمیانی علت نہیں ہے۔ خدا حکم دیتا ہے۔ بادل آپ سے آپ پیدا ہو جاتے ہیں اور برستے ہیں۔ یا یہ کہ آسمان پر ایک دریا ہے۔ وہاں سے پانی گرتا ہے۔ اور بادل بن جاتا ہے۔ چنانچہ قدمائے مفسرین اس بات کے قائل تھے۔ امام رازیؒ نے "اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" کی تفسیر میں ان کے اقوال نقل کئے ہیں۔ لیکن جب نظر اور آگے قدم بڑھاتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ دریا یا سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں۔ وہ اوپر جا کر سردی کی وجہ سے پانی کے قطرے بن جاتے ہیں۔ جس قدر حقیقت طلبی اور غور رسی بڑھتی جاتی ہے علل و اسباب کا سلسلہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ یہاں

تک کہ بالآخر اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ علت و معلول، سبب و مسبب، شرط و مشروط، اثر اور مؤثر کے سلسلہ کے بغیر نہیں ہوتا۔ اسی سلسلہ اور نظام کا نام فطرت اللہ، سنت اللہ، اور خلق اللہ ہے۔ اور قرآن کریم کا وعدہ ہے کہ ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ علل و اسباب کے مسئلہ کے متعلق جو اختلافات ہیں وہ صرف نزاع لفظی ہے۔ ہر شے کی کوئی نہ کوئی علت یا سبب موجود ہے۔ جس کا کوئی نہیں اس کا خدا ہے۔ ایمان والوں کے لئے یہ تسلیم کرنا کوئی مشکل نہیں کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔ منطقی طور پر یہی دلیل اس نظریہ کی نفی کر دیتی ہے کہ کائنات میں بعض واقعات پر علت و معلول (Cause and Effect) کا اصول لاگو نہیں ہوتا۔ قرآن کریم سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کیلئے پیمانے، اقدار اور اصول مقرر رکھے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا۔

"قانون خداوندی شروع سے ہی ایسا رہا ہے۔ اللہ کا قانون، اس کی مشیت کی رو سے مقرر شدہ پیمانوں کے مطابق بنتا ہے۔ (ہنگامی حوادث سے متاثر ہو کر نہیں بنا کرتا۔ اسی لئے وہ غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔) (الاحزاب 38) وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ۔ "اور اس نے ہر شے کے لئے پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ (13:8) وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ؕ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ ہمارے پاس (ارض و سماء میں) ہر شے کے بے بہا ذخیرے ہیں (جو تمہارے لئے سامان زیست بنتی ہیں) لیکن ہم انہیں ایک معینہ اندازے کے مطابق باہر لاتے ہیں (اس معینہ

اندازے کا دوسرا نام قانون فطرت ہے) (15:21) اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ- "ہم نے ہر شے کی تخلیق نپے تلے پیمانوں کے مطابق کی ہے"- (54:49) منکرین خدا کے علاوہ کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ معلول کا وجود بغیر علت کے ہو سکتا ہے- کائنات کے متعلق انسان کا علم بتدریج وسیع ہوتا جا رہا ہے- جوں جوں علم انسانی ترقی کر رہا ہے کائنات پھیلتی جا رہی ہے- ناممکنات ممکنات میں بدل رہی ہیں- خرق عادات' عادات مستمرہ بنتی جا رہی ہیں' ظلمات مٹ رہی ہیں اور نئے نئے حقائق منکشف ہو رہے اور قرآن کریم کے مطابق ایسا ہوتا چلا جائیگا- ارشاد ہے- سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط ہماری نشانیاں انفس و آفاق میں نمودار ہوتی چلی جائیں گی تاآنکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ حق و صداقت پر مبنی ہے- (41:53)

اللہ تعالیٰ بڑا لطیف و خبیر ہے- اس کی تدابیر اور احکام ایسے ایسے ذرائع سے بروئے عمل آتے ہیں جو انسانی شعور کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں- ارشاد ہے: اِنَّ رَبِّىْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ط اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ط حقیقت یہ ہے کہ میرا نشوونما دینے والا اپنی اسکیموں کو بڑے ہی لطیف انداز سے بروئے کار لاتا اور تکمیل تک پہنچاتا ہے- اس کی ہر بات علم و حکمت پر مبنی ہوتی ہے- (12:100) يٰبُنَىَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِىْ صَخْرَةٍ اَوْ فِى السَّمٰوٰتِ اَوْ فِى الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ- اے میرے بیٹے! خدا کا قانون ایسا ہے کہ اگر تمہارا کوئی عمل' رائی کے دانے کے برابر بھی ہو اور وہ کسی چٹان کے اندر چھپا کر رکھا ہو یا وہ ارض و سماء میں کہیں بھی ہو' خدا کا قانون مکافات اسے کھینچ کر سامنے لے آئے گا- اللہ اور اس کا قانون بڑا باریک بین اور ہر ایک کی حالت سے باخبر ہے (31:16)

ہم جن حادثات و واقعات کے متعلق سمجھتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا براہ راست کنٹرول ہے- جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں حادثاتی موت سے متعلق فرمایا ہے' عین ممکن ہے کہ اس وقت ان سے متعلق ہمارا علم ناقص ہو اور ہم اس قابل نہ ہوں کہ ان تمام علل و اسباب کا احاطہ کر سکیں جو کسی بھی واقعہ کو وجود میں لانے کا سبب بنتے ہیں- بہرحال' ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور تدابیر نہایت محکم' غیر متبدل اور خوب سوچی سمجھی ہوتی ہیں- جذباتی' لحاتی' اور مصلحت آمیز فیصلے کرنا ناقص علم اور کمزوری کا نتیجہ ہوتے ہیں- اللہ تعالیٰ کی ذات ان خامیوں سے پاک اور بہت بلند ہے- حضرت موسیٰؑ کو جب نبوت سے سرفراز فرمایا تو آپ کا سر نیاز اظہار تشکر کے لئے جھک گیا- اور کہا کہ بارالہا! مجھ پر یہ تیرا بہت بڑا احسان ہے- اس پر ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! تم پر ہمارا یہ احسان کچھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا- اس کا سلسلہ بہت پہلے سے شروع ہوا تھا- جب ہم نے تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی تمہاری ماں کی طرف حکم بھیجا تھا کہ تجھے صندوق میں ڈال کر دریا برد کر دے- ایک عام آدمی کی نگاہ میں آج بھی یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ آگ لینے گئے اور پیغمبری مل گئی- حالانکہ اس کے اسباب بہت پہلے سے ترتیب پانا شروع ہو گئے تھے-

جب ہم کسی واقعہ کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ سنت اللہ یا فطرت اللہ یا خلق اللہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ روز اول سے اسی طور

سے ہوتا چلا آرہا جو اس کے لئے مقرر ہے۔ کیونکہ سنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ موت و حیات سے متعلق جو بھی سنت اللہ ہے ہمارا ایمان ہے کہ روز ازل سے یکساں ہے۔ اس میں طبعی یا حادثاتی کی کوئی تخصیص نہیں۔ موت سے متعلق براہ راست کنٹرول کا تصور منطقی طور پر باطل قرار پاتا ہے جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ موت کیلئے اجل مقرر ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کی اجل 20 سال مقرر ہے تو وہ اس عرصہ کو پورا کر سکتا ہے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ کوئی دخل اندازی نہیں کریگا۔ علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ موت ایک بدیہی حقیقت ہے اور اس کائنات میں جتنی بھی بدیہات ہیں ان کے لئے علل و اسباب کا ہونا لازمی ہے۔ اب اگر موت کے بارے یہ تصور قائم کیا جائے کہ وہ علت و معلول کے سلسلے کے خلاف وقوع پذیر ہو تو یہ بالبداہت غلط ہو گا۔ کیونکہ علت و معلول کا علم انسان کو بداہتہ" حاصل ہوتا ہے اور جب موت اس کے خلاف ہے تو بداہت کے خلاف ہے۔ نظام فطرت میں جو چیزیں ہمیشہ ایک ایک طرح پر وقوع میں آتی ہیں ان کے استقراء سے جو علم کلی پیدا ہوتا ہے اسے بدیہی علم کہتے ہیں مثلاً سورج روشن ہے' آگ جلتی ہے' کل جز سے بڑا ہوتا ہے' دو متناقض ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتی اور ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے وغیرہ' اب ہم جب غور کرتے ہیں کہ بدیہی کیا چیز ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو علم انسان کو خود بخود یقینی طور پر حاصل ہوتا ہے' جس میں وہ کسی طرح شک نہیں کر سکتا۔ وہی بدیہی ہے۔ اس تبیان حقیقت کے بعد جب ہم کسی انسان کو دیکھتے ہیں تو ہم کو قطعی یقین ہوتا ہے کہ یہ شخص پہلے رحم مادر میں تھا' پھر رحم سے بچہ ہو کر نکلا' بچہ سے جوان ہوا! وغیرہ'۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں بلکہ وہ دفعتہ" پیدا ہو کر جوان ہو گیا تو ہم قطعاً" یقین کر لیں گے کہ یہ شخص غلط کہہ رہا ہے اور اس کا قول باطل و افتراء ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ ارض و سماء اور ان کے مابین جو بھی حوادث ظہور میں آتے ہیں وہ نظام مقررہ (قدرا" مقدورا") اور عادت مستمرہ (سنت اللہ) کے موافق و مطابق وقوع میں آتے ہیں۔ موت و حیات کا واقع ہونا بھی انہی قوانین فطرت کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موت و حیات کی حقیقت کو قرآن کریم میں جا بجا بیان فرمایا ہے اور اسے انسان کے حسن عمل کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے: **اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا**" ط موت و حیات خلق اللہ ہیں۔ اور انسان کیلئے حسن عمل کے پرکھنے کی کسوٹی (67:2)۔ اس آیہ کریمہ میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ موت خلق اللہ ہے۔ اور دوسرا اس کا مقصد۔ **لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا**"۔ قرآن کریم سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خلق اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جیسا کہ سورۃ الروم کی آیت تیس میں بیان ہوا ہے۔ **لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ** اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جو چیز غیر متبدل ہو اور عادت مستمرہ ہو تو وہ قانون کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا اس سے یہ قطعی ثابت ہو گیا کہ موت خدا کے قانون تخلیق کے مطابق واقع ہوتی ہے اور اس میں حادثاتی غیر حادثاتی کی کوئی استثناء نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اسے صلاحیتوں کے پرکھنے کا معیار قرار دیا ہے۔ **لِیَبْلُوَکُمْ** کا مفہوم ہے کہ ایسے مواقع بہم پہنچانا جن سے انسان کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آجائیں۔ اور معلوم ہو جائے کہ ان کی کس

حد تک نشوونما ہو چکی ہے۔ ان میں کتنا توازن اور حسن پیدا ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کی صلاحیتوں اور حسن عمل کو پرکھنے کیلئے موت و حیات کی کشمکش سے زیادہ بہتر کوئی موقعہ نہیں ہو سکتا۔ جب موت سامنے کھڑی ہو تو انسان اس کا مقابلہ اپنی بہترین صلاحیتوں سے کرتا ہے اور جو جتنی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے اسی نسبت سے سرخرو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری اہم بات یہ ہے کہ حسن عمل کا تصور انسان کے اختیار و ارادہ کی آزادی کا مظہر ہے۔ جبر کی زندگی حیوانیت کی زندگی ہے اور حیوان سے حسن عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک حیوان کو اپنی موت و حیات پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ وہ فطرت کے لگے بندھے اصولوں کے تابع زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کو ایک معینہ مدت تک اپنی موت و حیات پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا' متوازن صلاحیتیں عطا کیں اور اچھے برے کی تمیز سکھائی اور اس کے بعد اسے اختیار دیا کہ چاہے تو اچھائی کی طرف اور چاہے تو برائی کی طرف چلا جائے۔ خدا کے نزدیک انسان کا حسن عمل یہ ہے کہ وہ اختیار و ارادے کی آزادی کو خدا کے حکم کے مطابق استعمال میں لائے۔ کیونکہ اس کائنات میں صرف اور صرف احکام خداوندی کی تعمیل سے ہی اچھے اور تعمیری نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ حکم خداوندی کے آگے سرتسلیم خم کرنا ایسی صورت میں جبکہ سرکشی کا مکمل اختیار حاصل ہو حسن عمل کی بہترین مثال ہے۔ ایک شخص' یہ جانتے ہوئے کہ میدان جنگ میں اس کی زندگی کو زیادہ خطرہ لاحق ہے' وہ اللہ کے لئے جہاد کرتا ہے اس شخص سے ہزار درجے بہتر ہے جو موت کے خوف سے گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ موت تو بہرحال آنی ہے خواہ کتنے ہی محفوظ قلعوں میں پناہ کیوں نہ لے رکھی ہو۔ یہ موت بے بسی کی موت ہو گی۔ لیکن جب انسان علی وجہ البصیرت اپنی جان' جان آفرین کے سپرد کرتا ہے تو وہ امر ہو جاتا ہے۔ اس کی موت' حیات جاوداں کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے حسن عمل کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ اختیار و ارادے کی آزادی انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کی نعمت کبریٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان کو اس سے محروم نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ موت پر اللہ تعالیٰ کا براہ راست کنٹرول ہے انسان کو حیوان کے درجے پر پہنچا دینے کے مترادف ہے جو کہ کوئی انسان بھی تسلیم نہیں کریگا اور نہ ہی یہ درست ہے۔ ایک معینہ مدت (اجل مسمّٰی) سے پہلے انسان کو زندگی جیسی نعمت عظمیٰ سے محروم کرنا' صریحاً" ظلم ہے' اور اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان پر مثقال بھر ظلم نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بین الفاظ میں تردید کی ہے۔ ارشاد ہے: **وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ**۔ "ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خدا نے کسی پر کسی قسم کی زیادتی کی ہو۔ وہ خود اپنے آپ پر زیادتی کرتے تھے"۔ (29:40)۔

ڈاکٹر صاحب نے حادثاتی موت کے ثبوت میں اپنی زندگی کے جن واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہمیں ہر واقعہ کے پس پشت ایک نہیں بلکہ کئی اسباب نظر آتے ہیں اگرچہ ان میں بعض بڑے غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ ریل گاڑی کے سفر کے دوران آپ کو جو حادثہ پیش آیا اس میں آپ کی قوت بازو اور ڈرائیور کی حاضر دماغی نے آپ کو یقینی موت سے بچایا۔ اسی طرح دریا والے

واقعہ اور محاذ جنگ کے واقعات میں آپ کی شعوری قوتوں نے کام کر دکھایا جو کہ ایک عام سپاہی کی نسبت زیادہ نشوونما یافتہ تھیں۔ سکھ والے واقعہ میں اگر آپ اسے ست سری اکال کا سلوٹ نہ مارتے اور اپنا نام ہندوانہ نہ بتاتے تو سردار جی نے آپ کو کبھی معاف نہیں کرنا تھا۔ یہاں پر بھی آپ کو یقینی موت سے بچانے میں آپ کے عقل و شعور کی کارفرمائی تھی۔ سادہ لوح انسان یعنی وہ کہ جن کا عقل و شعور نشوونما یافتہ نہیں ہوتا اس لئے مار کھا جاتے ہیں کہ وہ معروضی صورت حال کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کے مطابق ممکنہ حفاظتی اقدام اٹھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا شعور جس قدر نشوونما یافتہ ہوتا ہے اس کا علم جس قدر وسیع اور عقل پختہ ہوتی ہے وہ اسی نسبت سے محفوظ و مامون زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارا مذہبی رجحان اس کی اہمیت کو دبائے رکھتا ہے اور ہماری عقل و شعور کو ابھرنے اور نکھرنے کا موقعہ نہیں دیتا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ عقل و مذہب کے مابین ازل سے ایک جنگ جاری ہے۔ دنیا میں آج جس قدر مذاہب موجود ہیں ان سب میں تلقین کی ابتداء اس حکم سے شروع ہوتی ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہ دو۔ ! یہی جابرانہ حکم ہے جس کی بدولت مذہب ہر قسم کی تحقیقات اور اجتہادات سے مطمئن رہتا ہے۔ اور ان میں سے کوئی چیز اس کی جباری کو کم نہیں کر سکتی۔ اسی کا اثر ہے کہ ایک شخص منطق، فلسفہ، ریاضیات میں سینکڑوں عجیب و غریب ایجادات کرتا ہے۔ اور ارسطو اور افلاطون کی غلطیاں نکالتا ہے۔ لیکن جب اس کے سامنے اس مسئلہ کا ذکر آتا ہے کہ "ایک تین ہیں اور تین ایک" تو اس کی نقادی اور نکتہ سنجی بالکل کند اور بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ سقراط اتنا بڑا فلسفی ہو کر جان دینے کے وقت وصیت کرتا جاتا ہے کہ فلاں بت پر میں نے نذر چڑھانے کی جو منت مانی تھی وہ پوری کی جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام مذاہب میں سینکڑوں حکماء و علماء پیدا ہوتے ہیں لیکن مذہب کے لغو سے لغو عقیدہ کی نسبت بھی ان کو شک نہیں پیدا ہوتا۔ بھارت کے وزیراعظم مرار جی ڈیسائی کا اپنا پیشاب پینا، پاکستان کے صدر مرحوم فیلڈ مارشل ایوب خان کا مری والے بابا لال شاہ کے پتھر کھانا اور پاکستان کی حالیہ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کا مانسہرہ کے قریب واقعہ بابا دھنکہ کی لاٹھیاں کھا کر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنا مذہب کی عقل پر فوقیت کی واضح مثالیں ہیں۔ مذہب کی گرفت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جب بنی اسرائیل نے دو اولوالعزم انبیاء حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی موجودگی کے باوجود سامری جیسے جاہل اور توہم پرست انسان کے بہکاوے میں آکر گئو سالہ کی پرستش شروع کر دی۔ عقل کی اس بے کاری سے صرف یہ نقصان نہیں پہنچتا کہ جو لغو عقیدہ ایک دفعہ قائم کر لیا گیا تھا وہ اپنے حال پر قائم رہتا ہے، بلکہ توہمات اور عجائبات پرستی کا زور روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب گذشتہ کئی سالوں سے قرآن کریم کی درس و تدریس سے منسلک ہیں۔ قرآن کریم کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس کا مطالعہ انسانی سوچ و فکر کی صلاحیت کو بیدار کرتا اور انسانی عقل و شعور کی نشوونما کرتا ہے۔ ظن و تخمین کے ظلمت کدوں سے باہر نکالتا ہے۔ انسان مثبت اور تعمیری سوچ کا حامل بن جاتا ہے۔ دلیل و برہان سے بات کرتا ہے اور دلیل و برہان سے بات تسلیم کرتا ہے۔ چونکہ قرآن قطعی

ثبوت ہے لہٰذا سب سے موثق دلیل اس کی آیات بینات ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دعوے کی ثبوت میں ایک بھی علمی دلیل نہیں دی اور نہ ہی قرآن کریم کے حوالے سے بات کی ہے۔ آپ کا سارا استدلال ظن و تخمین پر مبنی ہے اور مشکوک ہے۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے سچ تسلیم کر کے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بالعکس ہمارا استدلال سائنٹیفک ہے اور اسے قرآن کریم کی تائید حاصل ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف موت بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں ایک معینہ مدت مقرر کر رکھی اور ایک واضح قانون دے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نظام میں کوئی رد و بدل نہیں کیا جاتا۔ انسان کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اس کے مطابق چلے یا اس سے انحراف برتے۔ انسان جو روش اختیار کریگا' ویسا نتیجہ حاصل کریگا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور کی صلاحیت اور اختیار و ارادے کی آزادی عطا کی ہے۔ انسان کا عقل و شعور جس قدر نشوونما یافتہ ہو گا اسی نسبت سے انسان اپنے اختیار و ارادے کی آزادی کو بہتر طور پر استعمال اور اس سے مستفید ہو سکے گا۔ اگر انسان خدا کے بنائے ہوئے نظام حیات کے تابع سفر زندگی طے کریگا تو اپنی منزل پر صحیح و سلامت پہنچ جائیگا۔ ورنہ اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا۔ قرآن کریم کے تجویز کردہ نظام حیات میں انسانی عقل و شعور کی خوب نشوونما ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت عالمینی ہر شے کو محیط ہے۔ اس میں شعور یافتہ اور شعور سے عاری مخلوق میں کوئی تفریق نہیں۔ انسان شعور یافتہ ہے۔ اس کی نشوونما کے تقاضے مختلف ہیں۔ یہ تقاضے بھی اللہ تعالیٰ پورے کرتا ہے اور رب الشعریٰ کہلاتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ○ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى

"خدا کا نظام ربوبیت انسان کی جملہ ضروریات پوری کرنے کا انتظام ہے اس طرح کرتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کا محتاج نہیں رہتا۔ اور اسے وہ کچھ دیتا ہے جس سے اسے سکون اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ اس حد تک سامان پرورش میں' حیوان اور انسان سب مشترک ہیں۔ لیکن انسان کو عقل و شعور عطا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی ربوبیت کا انتظام بھی خدا کے نظام کی ذمہ داری ہے"۔ (53:48-49)

جوں جوں انسان کا شعور پختہ اور ترقی حاصل کرتا ہے اس پر زندگی کی نئی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ کامیابیوں و کامرانیوں کے نئے دروازے کھلتے اور اشیائے کائنات کی حدود واضح سے واضح تر ہوتی جاتی ہیں۔ موت جو اس وقت دل انسان میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہے اور اس کی رات کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں اسی اصول کے مطابق انسان کے تابع تسخیر ہو جائیگی اور ہر انسان اپنی طبعی عمر کو پہنچ سکے گا۔ طبعی عمر سے ہماری مراد زندگی کی تمام بہاریں ہیں جو بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کبریٰ کا بیان یوں کیا گیا ہے:

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط--- تمہیں اس نظام کی طرف اس لئے دعوت دی جا رہی ہے تاکہ تمہارے لئے اس تباہی سے محفوظ رہنے کا سامان پیدا کر دے۔ جو تمہاری لغزشوں اور جرائم کی وجہ سے تم پر وارد ہوتی ہے۔ اور اس طرح تمہیں ایک مدت معینہ تک زندگی کی کامرانیوں اور خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہونے کا موقع عطا کر دے"۔ (14:10)

ڈاکٹر صاحب کی مثل پر انسان کو زندگی میں کئی واقعات ایسے درپیش ہوتے ہیں جن کی وہ معقول

تشریح نہیں کر سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے جس کا ذکر ہم مندرجہ بالا سطور میں کر چکے ہیں۔ یعنی عقل و شعور کی ناپختگی ! یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پختہ شعور کے مالک ہوتے ہیں وہ زندگی میں حادثات کا کم شکار ہوتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو سادہ لوح ہوتے ہیں۔ میں خود جب اپنی زندگی کے تدریجی ارتقاء پر غور کرتا ہوں تو یہ حقیقت مزید نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ بچپن میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کبھی بازو ٹوٹ گیا' کبھی ٹانگ' کبھی کچھ حادثہ کبھی کچھ مصیبت۔ لیکن جب سے شعور پختہ ہوا ہے بڑی پرسکون زندگی بسر ہو رہی ہے۔ جب ڈرائیونگ سیکھی تو شروع شروع میں بڑے ایکسیڈنٹ کیئے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا تھا۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں بدستور کمی آتی گئی۔ اور اب کیفیت یہ ہے کہ نہ خود کسی کی گاڑی کو مارتا ہوں اور نہ ہی اپنی گاڑی کو مارنے دیتا ہوں۔ یہ کیا ہے؟ میں تو اسے عقل و شعور کی پختگی اور ترقی کہوں گا جو کہ عین منشاءِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ اور میرا ایمان ہے کہ جب تک ہوش و حواس سے کام لیتا رہوں گا۔ کبھی ٹھوکر نہیں کھاؤنگا ! انسان صرف نتائج کی حد تک مجبور ہے۔ قاعدہ و قانون اختیار کرنے میں اسے مکمل آزادی حاصل ہے۔ موت و حیات سے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو قاعدہ قانون مقرر کر رکھا ہے اس کے مطابق انسان اپنی زندگی گھٹا یا بڑھا سکتا ہے۔ اس کی شہادت قرآن کریم میں یوں بیان ہوئی ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ "خدا نے اپنے قانون تخلیق کے مطابق تمہاری پیدائش کی ابتداء جمادات سے کی۔ پھر وہ ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اس منزل میں جا پہنچی جہاں پیدائش بذریعہ توالد و تناسل ہوتی ہے۔ اس مقصد کیلئے ایک ہی نوع دو حصوں میں (نر و مادہ) تقسیم ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے قانونِ خداوندی کے مطابق رحم میں حمل قرار پاتا ہے۔ اور اس کے مطابق جنین کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس کے بعد کون کتنی لمبی عمر جیتا ہے اور کس کی عمر میں کمی ہو جاتی ہے یہ بھی خدا کے مقرر کردہ قانون طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر قانون طبعی کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو عمر بڑھ جاتی ہے۔ ان کی خلاف ورزی کی جائے تو عمر گھٹ جاتی ہے اور یہ سب کچھ بلا دِقّت ہوتا چلا جاتا ہے (35:11) ڈاکٹر صاحب مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ: "میں ان حالات میں کیونکر بچ گیا جب کہ موت عین سامنے کھڑی تھی؟ ہمارا جواب ہے کہ یہ آپ کے شعور کی پختگی تھی۔ آپ نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا جو کہ قانونِ فطرت کے مطابق تھا اور یوں آپ اَجَلِ مُسَمّٰی تک پہنچنے کے لئے بچ گئے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو قانون فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کی طرح لمبی عمر دے۔ آمین !

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد لطیف چوہدری

# رات کے ماتھے پر افسردہ ستاروں کا ہجوم

اپنی قوم کی مظلومیت دیکھ کر حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا تھا کہ مجھے اس مظلوم و محروم قوم کو الگ کر کے ایک الگ خطے میں بسا لینے دو جہاں یہ اپنی زندگیاں اپنے تصور کے مطابق گذار سکیں۔ یہی مطالبہ حضرت قائداعظمؒ نے ہندو سے منوایا۔ مگر ہوا کیا؟ قافلہ سالار رخصت ہو گیا اور قوم من و سلویٰ میں الجھ کر رہ گئی۔ اسلامی فلاحی مملکت اور اسلام کے عدل عمرانی پر مبنی نظام حکومت جس کا تحریک پاکستان کے دوران وعدہ کیا گیا تھا' نعروں کی حد تک رہ گیا۔ سیاسی پارٹیاں اور مذہبی فرقے برساتی مینڈکوں کی طرح بڑھنے لگے۔ قوم پارٹیوں میں بٹ گئی۔ اسلام فرقوں کی نذر ہو گیا۔ سیاست میں جمہوریت' بنیادی جمہوریت' کنٹرولڈ جمہوریت' پارلیمانی اور صدارتی نظام' سبھی آزمائے گئے مگر ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ قوم کا اجتماعی زوال ہماری غیرت کے لئے ایک چیلنج بن گیا۔ بڑھتی ہوئی سماجی برائیاں' غربت' جہالت' بدنظمی' اخلاقی انحطاط' سماجی گراوٹ اور سیاسی خلفشار ہمیں اپنی ذلت اور نامرادی کا احساس دلانے لگے۔ جھوٹ' فریب' مکاری' دغا بازی کا بازار گرم ہو گیا۔ رشوت ستانی اور حرام خوری کی لعنتیں ہم پر مسلط ہو گئیں۔ نااہلی' غلط اندیشی' تساہل نگاری' وعدہ خلافی' کام چوری' ملت فروشی' خود غرضی' ہوس پرستی اور زر اندوزی نے ہمارے ہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ اخبارات معاشرے کے لہولہان جسم کو سجا سجا کر پیش کرنے لگے۔ چوری' ڈاکہ' قتل و غارت روزمرہ کا معمول بن گئے۔ ظلم اور بے انصافی کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ ہمارا نوجوان نسلی' لسانی اور علاقائی تنگناؤں میں محدود ہو کر اپنی نظریاتی اساس سے بیگانہ ہونے لگا۔ وہ نوجوان جس نے ذروں کا دل چیر کر خورشید کا لہو تلاش کرنا تھا' کلاشنکوف تھامے اپنے ہی بھائیوں کے خون سے دامن تر کرنے لگا۔ جس مملکت کا حکمران صرف خدا کو ہونا تھا وہ جمہوریت اور سیکولرزم کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی۔ جس ملک میں تفرقہ بازی شرک تھی اس ملک میں پارٹی بازی عروج پر پہنچ گئی۔ جس مملکت میں رہنے والی قوم کو محبت کا پیکر ہونا تھا وہ ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو گئی۔ جو مملکت غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لئے وجود میں آئی تھی اس میں کافر گری کے ٹکسال لگ گئے۔

اس صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان ساری خرابیوں کا باعث وہ "بے دینی" ہے جو ہم نے اپنے اوپر از خود مسلط کر رکھی ہے۔ نہ ہمارا کوئی نظریہ ہے کہ ہمیں یک نگہی کی دولت حاصل ہوتی نہ ہمارا کوئی نظام ہے کہ ہمیں یک جہتی کی قوت میسر آتی۔ ایک مذہب تھا جو ہمارے اتحاد کا ذریعہ بن سکتا تھا لیکن اس میں بھی ہم' خیال اپنا اپنا' پسند اپنی اپنی کے قائل ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیں تو یہی ایک آئینی حق ہے جو 40 سال کی جدوجہد کے بعد

ہماری مذہبی پیشوائیت نے ہمارے لئے حاصل کیا ہے۔ خوش ہو جائیں ! کہ اب کوئی آپ کو "قرآن و سنت" کی کسی متفق علیہ تعبیر پر جمع ہونے کا حکم نہیں دے سکے گا۔ مطمعن رہئے ! کہ مذہبی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی قوم اب کبھی بھی ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہو سکیگی۔ دستور پاکستان میں اس کا خاطر خواہ اہتمام کر دیا گیا ہے۔ رہا سیاسی میدان' تو وہ لغت کو نئی اصطلاحات فراہم کرنے میں مصروف ہے۔ "لوٹا کریسی" ہمارے ہی دور کی دریافت ہے۔ اخلاقی پستی کا باعث "بے دینی" ہے تو لوٹ کھسوٹ کا باعث " بے لگامی" ہے' جو اب ہر سطح پر رائج ہے۔ ان حالات میں امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ یہ کہ اس کراسنگ کو تلاش کریں جہاں سے ہماری گاڑی غلط پٹڑی کی طرف مڑ گئی تھی۔ تحریک پاکستان کے ایام کا رخ کریں تو ہمیں یاد آجانا چاہئے کہ ہم نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ پاکستان قرآن کی سرزمین ہو گا۔ اس کا طرز حکومت اور نظام معاشرت قرآن کے اصولوں کا پابند ہو گا۔ تحریک پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ بھی یاد آجانا چاہئے کہ پاکستان کا یہ بنیادی نعرہ' جو برصغیر میں بسنے والے ہر مسلمان کا نعرہ تھا' بجز معدودے چند' ہمارے مذہبی راہنماؤں کو نہ اس دور میں پسند تھا نہ آج گوارا ہے۔ وہاں رہ کر انہوں نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور یہاں پہنچ کر نفاذ قرآن کو ناممکن بنانے کے لئے اس کے ساتھ لفظ "سنت" کا اضافہ کر لیا۔ جب کہا کہ حضور ! قرآن و سنت کی کوئی متفق علیہ تعبیر بتا دیجئے تو فرمایا قرآن و سنت کی کوئی تعبیر ممکن نہیں جو سب فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔ لہٰذا اس کی وہی تعبیر قبول کرنا ہو گی جو اپنے فرقے کے لئے ہم کریں گے۔ نتیجہ یہ کہ وہ قوم جس نے متحد ہو کر اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے تھامنا تھا ٹکڑیوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لاتعلق ہو گئی۔ ان حالات میں مراجعت کی اگر کوئی صورت باقی ہے تو صرف یہ کہ اگر ہم بطور مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان میں وہی نظام قائم کرنا ہو گا جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ ورنہ قوم جس طرح اندھیروں میں بھٹک رہی' بھٹکتی رہے گی اور پھر ایک دن سپین کے مسلمانوں کی طرح' ہماری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔

آئینی اصلاحات اور اس ملک میں نفاذ شریعت کا حشر ہم نے دیکھ لیا۔ مذہبی پیشوائیت کی پیشوائی بھی آزما لی۔ سیاستدانوں کے جمہوری تماشے کا نظارہ بھی کر لیا۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم ملک میں نفاذ قرآن کا مشن لیکر اٹھیں اور باد بہاراں کی طرح چمن کے پتے پتے تک یہ پیغام پہنچا دیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لئے ہمیں بہت سارے بت توڑنا ہوں گے۔ پہلے اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنا ہو گا اور سربکف میدان میں اترنا ہو گا' لیکن یہ وہ راستہ ہے جس پر گامزن ہونے کے بعد منزل کا حصول یقینی ہو جاتا ہے۔

تحریک طلوع اسلام بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔ تحریک کا پروگرام یہ ہے کہ ماضی کے وہ چراغ اٹھا کر مستقبل کی گذر گاہوں پر رکھ دے' جن کی روشنی میں قافلہ اسلام پھر سے ان گذر گاہوں پر گامزن ہو جائے جن پر رسولؐ اللہ اور ان کے ساتھیوںؓ کے قدم جگمگا رہے ہیں۔ یہی وہ گذرگاہ ہے جس پر قدم رکھتے ہی امن و سکون کی ضمانت مل جاتی ہے۔ تحریک طلوع اسلام کے دست و بازو بنئے اور یاد رکھئے !

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشیر احمد بشیر

# مزدوروں کی فلاح و بہبود

اس روئے زمین پر سب سے اعلیٰ اور ارفع مخلوق انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ایسی فرمائی ہے کہ یہ تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ انسان ایک دوسرے سے تعلقات رکھنے پر مجبور ہے تاکہ ایک انسان کی ضرورت جو وہ خود پوری نہ کر سکتا ہو اس کے لئے کسی دوسرے انسان کی مدد لی جائے۔

اللہ نے فرمایا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ (96/2) اللہ نے انسان کی تخلیق ہی اسی طرح سے فرمائی کہ گویا وہ تعلقات سے ہی پیدا کیا گیا انسان ایک دوسرے سے تعلقات رکھنے پر مجبور ہے۔

(Man has been Created to be Social)

انسانی سرشت اور جبلت ایسی ہے کہ ہر انسان کی قوت و صلاحیت اور استطاعت کار دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہے۔ اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ○ (92/4) تم سب مرد و زن کا میدان سعی و عمل الگ الگ ہوتا ہے۔

کچھ لوگ جسمانی لحاظ سے زیادہ تنو مند اور طاقت ور ہوتے ہیں وہ سخت محنت اور مشقت کے کام کر سکتے ہیں۔ دوسرے گو جسمانی لحاظ سے زیادہ طاقت ور نہ ہوں مگر ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں وہ علمی کام باحسن طریق انجام دے سکتے ہیں۔ مثلاً ایک فوجی جرنیل کے لئے جسم اور علم (علم حرب و ضرب اور قتال) کا ہونا اشد ضروری ہے چاہے وہ مالی لحاظ سے کمزور ہی کیوں نہ ہو (2/247)

قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ بعض لوگ سامانِ رزق وافر مقدار میں حاصل کر لیتے ہیں مگر کچھ لوگ اتنا بھی حاصل نہیں کر پاتے کہ وہ دو وقت کی روٹی عزت و آبرو سے کھا سکیں۔ اس کا حل قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ جن کو رزق زیادہ میسر آجائے ان کا فرض ہے کہ وہ اس رزق میں ان لوگوں کو شریک کریں جو کسی وجہ سے رزق کی معقول مقدار حاصل نہ کر سکے ہوں اور ان پر اس کا کوئی احسان نہ دھریں بلکہ ان کا حق سمجھ کر ان کو لازماً اپنے رزق میں شریک کریں---- اس لئے مصلّین (نظام صلوٰۃ قائم کرنے والوں) کے متعلق فرمایا کہ ---- وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (70/24-25) (ان مصلین کے اموال میں سائل اور محروم کا معلوم اور مقرر حق ہے) مگر افسوس کہ مسلمان قوم ان ہدایات پر کماحقہ عمل نہیں کر رہی۔

زمانہ و نزول قرآن کے وقت غلامی کا رواج عام تھا۔ غلاموں کے لئے قرآن نے مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (تمہارے زیر دست) کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے ان میں ایک تو غلام شامل ہیں مگر دوسرے عام ملازمین بھی انہی میں آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کے حقوق واضح فرما دیئے ہیں اور ان پر سختی سے عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ (نزولِ قرآن کے بعد غلامی کو قطعی طور پر

ختم کر دیا گیا۔ اس وقت کسی مسلم مومن کو غلام رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیوں کہ غلامی انسان کی تذلیل ہے اور قرآن کریم کا یہ فرمان ہے کہ۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17/70) ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم بنایا ہے۔

اب اگر کچھ لوگ مالک اور آقا ہیں اور دوسرے ان کے ماتحت اور ملازم ہیں تو ظاہر ہے کہ ایک آقا کے وسائل رزق ایک ماتحت کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتے ہیں------ مگر اللہ نے فارمولا یہ دیا ہے کہ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○ (16/71)

یہ ٹھیک ہے کہ اللہ نے تم میں سے بعض کو دوسروں پر رزق کے معاملہ میں کچھ فضیلت اور فوقیت دے رکھی ہے------- مگر جن کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جو ان کے ماتحت (زیر دست) تنگ حال ہیں وہ ان کو اپنے رزق میں شریک کر لیں تاکہ یہ سب رزق کے معاملہ میں برابر ہو جائیں۔ (قرآن جو معیشت قائم کرنا چاہتا ہے یہ اس کا بنیادی اور کلیدی نکتہ ہے)

ایسا نہ کر کے کیا یہ لوگ اللہ کی نعمت کے منکر بننا چاہتے ہیں۔

(اگر اسی ایک فارمولے پر کماحقہ' عمل کر لیا جائے تو کوئی شخص بھوکا اور بے رزق نہ رہے مگر افسوس کہ مسلمان قوم واقعی اللہ کی نعمتوں کی منکر بن چکی ہے جس کی وجہ سے یہ قوم نکبت۔ ذلت اور ادبار کی زد میں آچکی ہے)۔

مزدور یا محنت و مشقت کا کام کرنے والے بھی انہی زیر دستیوں اور تنگ حال لوگوں میں آتے ہیں۔

لہٰذا قرآن کریم کی رو سے جب کسی مزدور سے کام کرایا جائے تو اس کو اجرت یا مزدوری اس قدر دی جائے کہ وہ رزق کے معاملہ میں آجر کے برابر ہو جائے۔ جیسا طعام و لباس آجر اور اس کے گھر والوں کو مہیا ہو ویسا ہی مزدور اور اس کے گھر والوں کو میسر آنا چاہئے۔ (مگر افسوس کہ مسلمان قوم اس ہدایت سے بھی منہ موڑ چکی ہے ہم لوگ مزدور سے کام تو اس قدر لیتے ہیں مگر مزدوری دیتے وقت کبھی نہیں سوچتے کہ اس سے اس کو اور اس کے گھر والوں کو عزت و آبرو کی روزی بھی ملے گی یا نہیں واضح رہے کہ قرآن کریم رزق کریم پر زور دیتا ہے (عزت کی روٹی) (34/4,24/26,22/50,8/4) وغیرہ)

قرآن کریم نے جناب موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بطور ایک مزدور کے فرمایا ہے۔ اس قصہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مزدور کا کردار کیا ہونا چاہئے اور آجر کا اس سے کیا سلوک ہونا چاہئے--- ہم یہ قصہ ذرا تفصیل سے پڑھتے ہیں تاکہ آجر اور اجیر کے حقوق و فرائض کھل کر سامنے آجائیں۔

ارشاد ہے :-

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۡ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۭ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ○ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ○ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا

تَخَفْ قف نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ قَالَتْ
اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ز اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ
الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ○ قَالَ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى
ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ج فَاِنْ
اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ج وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ
عَلَيْكَ ط سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○
قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ط اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا
عُدْوَانَ عَلَيَّ ط وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ○

(28/23-28)

23- اور جب (چلتے چلتے) جناب موسیٰ علیہ السلام مدین کے پیاؤ (جانوروں کو پانی پلانے کی گھاٹ یا کنواں) پر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ (چرواہے، اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہے ہیں- اور ان سے ذرا ہٹ کر دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ہیں--- آپؑ نے ان دونوں سے پوچھا کہ آپ کا کیا معاملہ ہے- انہوں نے کہا کہ جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو ہٹا کر نہ لے جائیں ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں- (ہم اپنے جانوروں کو باہر لے جانے پر مجبور ہیں کیونکہ) ہمارے ابو بہت بوڑھے ہیں-

تو آپؑ نے ان دونوں کے جانوروں کو پانی پلا دیا- پھر آپؑ وہاں سے ہٹ کر ایک جگہ سائے میں جا بیٹھے- (چونکہ آپؑ سفر میں تھے اور غیر ملک میں تھے- کھانے وغیرہ اور رہائش کا کوئی بندوبست نظر نہ آرہا تھا تو) آپؑ نے اللہ سے دعا کی کہ اے میرے رب اس وقت تو جو بھی خیر مجھ پر نازل فرما دے میں اس کا ہی محتاج ہوں--- اتنے میں ان دو خواتین میں سے ایک لجاتی شرماتی شرم و حیا کا مجسمہ بنی ہوئی ان کے پاس آئی- اس نے کہا کہ میرے ابو آپؑ کو بلاتے ہیں تاکہ آپ نے جو ہمارے جانوروں کو پانی پلا دیا ہے آپ کو اس کا اجر (مزدوری) دیں- چنانچہ جب آپؑ ان کے پاس آئے اور اپنی سرگذشت ان کو سنائی تو انہوں نے فرمایا کہ آپؑ کچھ خوف نہ کریں- آپؑ اب ظالم قوم سے نجات پا چکے ہیں- (یہ علاقہ فرعون کی حدود سلطنت سے باہر ہے اور یہاں آپؑ کو کوئی خطرہ نہیں ہے)

ان دو خواتین میں سے ایک نے اپنے ابو سے کہا کہ ابا جان اس (نوجوان) کو مزدوری پر (ملازم) رکھ لیں-

کیونکہ جو بہتر ملازم آپ رکھنا چاہیں گے اس کو قوی اور امین ہونا چاہئے (اور ماشاء اللہ یہ دونوں خوبیاں اس نوجوان میں بدرجہ اتم موجود ہیں)

تو انہوں نے آپؑ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا آپؑ سے نکاح کر دوں اس شرطؒ پر کہ آپؑ 8 برس میرے پاس ملازمت (مزدوری) کریں- اور اگر آپؑ 10 برس پورے کر دیں تو یہ آپؑ کی طرف سے احسان ہو گا-- اور میں آپؑ پر سے کسی قسم کی مشقت ڈالنے کا قطعاً" کوئی ارادہ نہیں رکھتا- انشاء اللہ آپؑ مجھے صالح (اپنے وعدہ کا پابند اور ہمدرد ہی) پائیں گے-

آپؑ نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ کے اور میرے درمیان یہ طے پا گیا میں اپنی خوشی سے جو بھی مدت چاہوں پوری کر دوں گا آپ کی طرف سے مجھ پر کسی قسم کا جبر اور زیادتی نہ ہونا چاہئے--- اور ہمارے اس قول و قرار پر اللہ وکیل (اور گواہ) ہے-

اس قصہ مبارک میں جناب موسیٰ علیہ السلام کو بطور اجیر (مزدور) کے پیش کیا گیا ہے اور آپؑ کے سسر کو بطور آجر کے سامنے لایا گیا ہے- ہم دیکھتے ہیں

کہ ایک اجیر اور آجر کے الگ الگ کیا فرائض اور حقوق ہونا چاہئیں۔

(1) اجیر:-

i- ایک اجیر یا مزدور کو اس قدر ہنر مند اور قوی ہونا (Skill) چاہئے کہ جو کام وہ کرنے چلا ہے اس کو باسانی کر سکے۔

ii- اس کو نہایت امین اور امانت دار ہونا چاہئے۔

iii- اس کی شرافت و نجابت کی گواہی نامحرم خواتین تک دے سکیں۔

iv- وہ اپنے آجر سے جو معاہدہ کرے اس کو پورا کرنے کا پابند ہونا چاہئے۔

v- اس کو اپنے کوائف نہایت ایمانداری سے اپنے آجر کو بتا دینا چاہئیں۔

(2) آجر:-

i- آجر کو ہمدرد اور غم گسار ہونا چاہئے۔

ii- اس کو اپنے اجیر سے مزدوری اور معاوضہ طے کرتے وقت اس کی رائے لینا ضروری ہے۔

iii- وہ جابر اور سخت گیر نہ ہو۔

iv- اس کا کردار ایک صالح اور ہمدرد کا سا ہونا چاہئے۔

v- جو معاہدہ اس کے اور اس کے اجیر کے درمیان طے پا جائے اس پر پابند ہونے کا وہ خود بھی مکلف ہے اور اجیر سے بھی یہ مطالبہ کر سکتا ہے کیونکہ اجیر پر بھی ایسا کرنا فرض ہے۔ آجر اور اجیر کے مابین اکرام و احترام اور مودت و رحمت کی ایسی فضا قائم ہونا چاہئے جو باہم قریبی اعزاء و اقرباء میں ہوتی ہے۔

اگر مسلمان قوم ان ہدایات پر عمل کرنا شروع کر دے تو یہ زمین اللہ کے نور سے جگمگا اٹھے۔

(39/69)

# ایمان سستا ہو گیا ہے

(پروفیسر نجمی صدیقی صاحب کی نظم جو انہوں نے 8 ستمبر 1995ء کو پشاور میں یوم دفاع کی تقریب میں پڑھی۔ مدیر)

سمجھتا ہے نہ کوئی سوچتا ہے
ہمارے دین کو کیا ہو گیا ہے

عبادت انفرادی ہو گئی ہے
کسی سے کیا کسی کو واسطہ ہے

سپر انداختہ بے آسرا ہیں
عدو ہر سمت سے چڑھ دوڑتا ہے

یہ امت ریزہ ریزہ ہو گئی ہے
جدھر دیکھو نیا اک سلسلہ ہے

یہ سجدوں اور درودوں کے لبادے
اب ایمان کتنا سستا ہو گیا ہے

نبیؐ کا دور واپس لاؤ جس میں
جو بوتا ہے وہی خود کاٹتا ہے

کوئی دوچار ہوں تو ڈھونڈ لائیں
یہاں گمراہ سارا قافلہ ہے

عمرؓ نے اپنے بیٹے کو نہ بخشا
مسلماں اب سفارش ڈھونڈتا ہے

بس اب قرآن گایا جا رہا ہے
عمل کا تو حوالہ رہ گیا ہے

یہ ناداروں کے لشکر کون دیکھے
فقط نعروں سے گنبد گونجتا ہے

یہ بادل چھٹ گئے تو پھر کہیں گے
کوئی کافر مسلماں ہو گیا ہے

ہے قرآں اب حوالوں کا صحیفہ
ہر اک اپنا حوالہ ڈھونڈتا ہے

نہ تحریروں نہ تقریروں سے نجمیؔ
خدا کا دیں عمل سے پھیلتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد ارشاد (مری)

# فہمِ قرآن کے متعلق گزارشات

مکرمی ! ہمارے ملک میں تقریباً تمام تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر ان کے سامنے قرآن پاک کی کچھ آیات پڑھی جائیں یا اگر وہ تعلیم یافتہ لوگ خود پڑھیں تو انہیں ایک غیرمادری زبان کی تحریر سے کماحقہ' سمجھنے کا اشتیاق پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں مفہوم بتایا جائے تو وہ سرسری سی توجہ دیتے ہیں اور بس !

کہنے کو تو ہم قرآن کریم کو اللہ تعالٰی کی حقیقی اور آخری کتاب مانتے ہیں۔ جس کے مقابلے میں تمام دنیا کی کتابیں ہیچ ہیں۔ چاہے وہ کتابیں ماضی کی ہوں یا موجودہ زمانے کی یا وہ جو مستقبل میں لکھی جائیں گی۔ ہم قرآن کو الہامی کتاب مانتے ہیں اور ہدایت اور دین کا واحد ذریعہ مانتے ہیں۔ مگر عملی طور پر حالت یہ ہے کہ قرآن کو ناظرہ طور پر تو شاید کچھ لوگ پڑھ لیں۔ لیکن ان میں اسے سمجھنے کی اہلیت بالکل نہیں ہوتی۔ جمعہ کے دن عربی زبان میں خطبہ سنتے ہوئے' گھر یا مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے یا قرآنی دعاؤں پر آمین کہتے ہوئے ہماری حالت بھی ایسی ہی ہوتی ہے کہ ہم کسی عربی آیت یا عربی عبارت کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ قرآن کریم کو نہ سمجھنا ایک پردہ کی مانند ہے۔ جو اللہ اور ہمارے درمیان حائل ہے۔ جس کے باعث ہم اللہ تعالٰی کے احکام و فرمودات سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے سے بھی عاری ہیں۔ قرآن کریم نے (جو رشد و ہدایت ہے اور ہماری زندگیوں کو سرسبز و شاداب کر دینے کا آب حیات لئے ہوئے ہے۔) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جانی دشمن کو چند لمحوں میں نور ہدایت سے سرشار کر دیا تھا اور دنیائے اسلام کا سب سے بڑا محافظ بنا دیا تھا۔ لیکن ہم قرآن کریم کا مفہوم نہ سمجھنے کے باعث اس دنیا و آخرت دونوں کی خوشگواریوں سے محروم ہیں اور ہماری دعائیں شرف قبولیت حاصل نہیں کر سکتیں۔ آخر ایسی بات کیوں ہے؟ اس کے متعلق ہمیں غور و خوض کرنا چاہئے۔

اس کی بنیادی وجہ من حیث القوم یہی رویہ ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہم زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ اپنے بچوں کو قرآن ناظرہ پڑھا دیں اور بس ! بعض لوگ کچھ آگے بڑھیں گے اور بچوں کو قرآن زبانی یاد کرا دیں گے۔ یا پھر کسی قاری صاحب سے قرات کے طریقے سکھا دیں گے۔

ہمارا معمول اور خیال ہے کہ قرآن پڑھ لیا جائے اور ثواب حاصل کر لیا جائے۔ اسی بات کو ہم کافی سمجھتے ہیں اور قرآن کریم کے حکمت و فراست کے بھرپور خزانے سے ہم بس یہی رویہ اپنا کر سمجھتے ہیں کہ سرخرو اور کامیاب ہو گئے ہیں حالانکہ ہم بہت نقصان میں ہیں۔ ہم قرآن کریم کے اصول و احکامات کے خزانوں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔

ہمارا نصاب تعلیم بھی اسی انداز سے تیار کیا جاتا ہے۔ جہاں سکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کا مضمون اسلام کا نامکمل پیغام بچوں تک پہنچاتا ہے اور پھر ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں اسلام کا بول بالا کریں گی۔ ہم بچوں کو اس قابل

کوشش ہی نہیں کرتے کہ جب وہ اللہ کا کلام یعنی قرآن پڑھیں یا سنیں تو وہ ان کے دل کی گہرائیوں میں اترے اور ان کی سوچ اور فکر کو درست کر کے ان کو صحیح راستے پر ڈال دے۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ سوچ اور فکر کو درست کر کے اپنی آئندہ نسلوں کو قرآن کریم کے بے پناہ خزانے سے محروم ہونے سے بچائیں۔ انگریزی زبان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بیس سال قبل ہمارے سکولوں میں انگریزی پہلی جماعت سے شروع ہوتی تھی۔ گیارہویں جماعت میں طالب علم کو سائنس وغیرہ کے تمام مضامین انگریزی میں پڑھنے ہوتے تھے اور امتحانی پرچہ جات بھی انگریزی میں حل کرنے ہوتے تھے۔ اس طرح کسی حد تک طالب علم میں انگریزی بولنے کی اہلیت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ انگریزی ایک غیر مانوس زبان ہے اور اس کا رسم الخط بھی مختلف ہے۔ لیکن ہمارے بچے اس کو سیکھ لیتے ہیں۔ قرآن کی زبان ہماری اپنی زبان اردو کے بہت قریب ہے رسم الخط بھی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اردو نے بہت سے الفاظ عربی زبان سے اخذ کئے ہیں۔ علماء کہتے ہیں کہ پندرہ سولہ سو عربی کے الفاظ سیکھنے اور سمجھنے سے قرآن حکیم کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن حکیم کو سامنے رکھ کر صرف و نحو کے قواعد ترتیب دیئے جا چکے ہیں جن سے قرآن حکیم کے سیکھنے اور سمجھنے میں بہت آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

سکولوں میں عربی پڑھانے والے اساتذہ بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان تمام سہولتوں کے باوجود ہمارا نظام تعلیم ہماری نسلوں کی درست سمت میں رہنمائی نہیں کر رہا ہے۔ اس کے متعلق تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ نقصان تو بہت ہو چکا ہے۔ لیکن اب بھی ہمیں چاہئے کہ صحیح راہ اختیار کریں۔ اس بارے میں کچھ تجاویز تحریر ہیں۔ جنہیں اپنا کر ہم اپنی درست منزل حاصل کر سکتے ہیں۔

1- تعلیم کے نصاب میں ضروری تبدیلی : اردو اور انگریزی میڈیم سکولوں میں حکومت پنجاب نے حال ہی میں 27-5-89 کی چھٹی دوبارہ جاری کی ہے جس کے مطابق جماعت دوم سے جماعت دہم تک باقاعدہ تدریس زبان عربی اور قرآن کا اہتمام کرنے کی ہدایت دی گئی ہے (جس کے لئے حکومت پنجاب تحسین و تبریک کی مستحق ہے۔) جماعت سوئم سے ہی قرآن فہمی کا تعلیمی نصاب شروع کیا جا سکتا ہے۔

تیسری جماعت سے جماعت دہم تک آٹھ سال کا عرصہ قرآن فہمی کیلئے مناسب عرصہ ہے۔ قرآن فہمی کا ہدف حاصل کرنے کے لئے "نصاب فہم قرآن" علمائے کرام اور ماہرین تعلیم کی مدد سے مرتب کیا جائے جس سے طلباء و طالبات میں یہ اہلیت پیدا ہو کہ وہ قرآن حکیم کو ناظرہ پڑھتے ہوئے اور قرآن کی آیات سن کر ان کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھ سکیں۔ اور اس طرح آئندہ زندگی میں قرآن کریم کے اصول واحکامات پر عمل پیرا ہو سکیں۔ فکر و عمل کی راہوں کو روشن کر سکیں اور اپنے رب کی بے شمار نعمتوں سے بہرہ ور ہوں۔

اس کام کو حکومت کے قائم کردہ تعلیم کے متعلق اسلامائزیشن کمیشن یا اسلامی نظریاتی کونسل کے سپرد بھی کیا جا سکتا ہے۔ جسے کم سے کم عرصے میں ترجیحی طور پر مکمل کیا جائے اور حکومت کی منظوری کے بعد نافذ کیا جائے۔ اس بارے میں اساتذہ کی تربیت کے لئے بھی خصوصی ریفریشر کورسز بھی شروع کیئے۔ تاکہ یہ کام بہتر طور سے پایہ تکمیل کو پہنچے۔

2- بالغوں کو ناظرہ قرآن اور قرآن فہمی کی تعلیم دینے کے لئے پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان سے خصوصی پروگراموں کا آغاز کیا جائے۔ خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کے لئے علیحدہ علیحدہ پروگرام رکھے جائیں۔ ان پروگراموں کا مقصد بھی قرآن کا پڑھنا اور اس کا ادراک یعنی سمجھنا ہونا چاہئے۔

3- مساجد میں ہر جمعہ کو خطبہ سے پہلے ایک ایک رکوع یا دو دو رکوع درس قرآن کو لازمی قرار دیا جائے جس میں صرف ترجمہ قرآن' صرف و نحو اور لغت عربی سے استفادہ کیا جائے۔ اس طرح ملت کا کافی افرادی حصہ درس قرآن اور قرآن فہمی سے سرفراز اور سمجھدار ہونے لگے گا۔ وما علینا الا البلاغ

---

## شاعری نے مار ڈالا اس قوم کو!

"مسلمانو! تمہاری رگوں میں خون نہیں' تڑپنے اور مچلنے والی بجلیاں ہیں جو باطل کے خس و خاشاک کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیں گی۔ تمہارے سینے متاع ملی کے امین ہیں۔ دنیا کی کوئی قوت اس امانت کو تم سے چھین نہیں سکتی۔ ہم نے دنیا کے روباہ بازان ازلی سے بار بار کہا کہ اس شیر نیستان کو سویا رہنے دو۔ اسے مت چھیڑو۔ یہ جاگ اٹھا تو دنیا میں قیامت برپا کر دے گا۔ پھر تمہیں نہ زمین میں پناہ ملے گی نہ آسمان پر۔ لیکن ان ناعاقبت اندیشوں نے ہماری اس پکار کو محض ہنسی سمجھا اور اس اسد بیشہ حریت و بسالت کو جگا کر چھوڑا۔ مسلمانو! اس چیلنج کو قبول کرو۔ اٹھو بیدار ہو جاؤ۔ اور باطل کی قوتوں کو بتا دو کہ

"آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا"

آپ کسی جلسہ میں جایئے۔ ہر تقریر اسی قسم کی شعلہ فشانیوں سے فضا کو معمور کرتی دکھائی دے گی۔ آپ گھنٹوں سنتے جایئے۔ ہر روز سنئے۔ کہیں سنئے۔ کسی سے سنئے۔ چند الفاظ ہوں گے طنطنہ خیز اور چند فقرے ہوں گے ولولہ انگیز اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ کوئی انہیں یہ نہیں بتائے گا کہ وہ بالآخر کیا کریں؟ کسی مقرر کے سامنے کوئی اسکیم نہیں ہو گی۔ کوئی تدبیر نہیں ہو گی۔ کوئی عملی تجویز نہیں ہو گی۔ نتیجہ یہ کہ قوم بھی ان لچھے دار تقریروں کی عادی ہو گئی ہے۔ وہ جلسے اور مشاعرے میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔ تھوڑے وقت کے لئے دل بہلانے کا سامان۔ یونہی دفع الوقتی اور بس۔ دل لرز اٹھتا ہے یہ سوچ کر کہ بالآخر شاعروں کی اس قوم کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ کیا اس ہجوم انام میں ایک بھی "رجل رشید" نہیں جو انہیں کوئی کام کی بات بتائے اور انہیں راستہ پر لگائے؟ لفظوں سے محلات تعمیر کر دینے والے ہزاروں نظر آتے ہیں۔ عملی اسکیم سے بنیاد رکھنے والا کوئی نہیں ملتا! تم جس جلسے میں جاؤ مقرر سے کہدو کہ "ہم سے دو ٹوک بات کرو اور سیدھے سادے لفظوں میں یہ بتاؤ کہ ہم کیا کریں اور کیسے کریں! اس سے زیادہ ہم کچھ سننا نہیں چاہتے"۔ آپ دیکھیں گے اس بے معنی تقریر بازی کا سلسلہ کتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہی سامنے آنے کی جرات کرے گا جس کے پاس واقعی کوئی تعمیری پروگرام ہو گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد عمر
(گلشن راوی لاہور)

# موت کا ایک دن معین ہے؟

فرمان خداوندی ہے :

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ○ (3:145)

"کسی شخص میں یہ طاقت نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے' اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے۔"

اس آیت کے حوالہ سے محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا مضمون طلوع اسلام کے اگست 1995ء کے شمارے میں پڑھا جس میں انہوں نے زندگی کی اٹل حقیقت یعنی موت کے موضوع پر بحث کا آغاز کیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں محترم پرویزؒ صاحب کا نظریہ بیان کر کے اس سے قدرے اختلاف کرتے ہوئے اپنی تائید میں' اپنی ہی زندگی کے کچھ واقعات پیش کئے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب یہ بھی بتاتے کہ ان واقعات کو پیش کرنے کے بعد محترم پرویزؒ صاحب نے کیا توجیح پیش کی تھی؟ محترم پرویزؒ صاحب اگرچہ اپنی بات کو ہمیشہ ایک انسانی کوشش بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ حرف آخر نہیں ہے لیکن اس موضوع پر اگر ان کا نظریہ' وضاحت سے بیان کر دیا جاتا تو قارئین کے لئے مزید دلچسپی کا باعث بنتا۔

اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس بحث سے دو مختلف نظریات سامنے آگئے۔

1- موت صرف طبعی قوانین کے تحت واقع ہوتی ہے۔

2- موت اللہ کے اذن کے بغیر نہیں آسکتی۔

موت کا وقت اللہ نے مقرر کر رکھا ہے یہ بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے پوچھا ہے کہ اگر "اذن" کے معنی قانون ہے تو وہ ان حالات میں کیسے بچ گئے جب کہ موت ان کے سامنے کھڑی تھی۔

میں قرآن کریم کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی رائے قرآن کی مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں ایک پہیلی کے ذریعے پیش کرتا ہوں۔

"مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس خطرناک پہاڑی راستے پر چل رہی ہے۔ اچانک دو مسافر جو آپس میں دوست ہیں ڈرائیور کو اشارہ کرتے ہیں کہ بس روک دو اور وہ اتر جاتے ہیں۔ جونہی بس چند گز آگے بڑھی تو ایک بہت بڑی چٹان پہاڑ کے اوپر سے لڑھکتی ہوئی بس کے اوپر اس طرح گری کہ پوری کی پوری بس پچک کر رہ گئی اور کوئی بھی مسافر زندہ نہ بچا۔ زندہ صرف وہی دو بچے جو بس سے کچھ سیکنڈ پہلے اترے تھے۔ اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے ان میں سے ایک نے کہا 'کاش ہم بس سے نہ اترتے تو ہم سب بچ جاتے۔"

یہ ایک پہیلی ہے۔

مجھے اندازہ ہے کہ قارئین اپنی عقل دوڑا

رہے ہونگے کہ اس میں حقیقت کیا ہے۔ پہیلی میں جواب ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے سوچنا پڑتا ہے۔

مندرجہ بالا پہیلی میں قرآن کی اس آیت کے دونوں حصے موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ طبعی قوانین کے تحت' چٹان بس میں سوار تمام مسافروں کو موت کی نیند سلا سکتی تھی۔ بشرطیکہ بس مقررہ وقت پر چٹان کے نیچے موجود ہوتی۔ یعنی جو بچ جانے والے مسافر نے کہا کہ اگر ہم بس سے نہ اترتے تو سب بچ جاتے۔ یعنی موت کا وقت ٹل جاتا اور بس چٹان گرنے سے پہلے آگے بڑھ چکی ہوتی۔ گویا دو مسافروں کے اترنے سے بس جو چند سیکنڈ پیچھے رہ گئی' اس نے وقت کی شرط پوری کر دی۔

اس سلسلے میں ایک مثال اور پیش کرتا ہوں۔ جن مجرموں کو موت کی سزا ہو چکی ہو۔ ان کو عام طور پر طلوع آفتاب سے پہلے پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے۔ ان کی موت کا وقت ڈیوٹی پر موجود مجسٹریٹ گھڑی دیکھ کر اشارہ کر کے متعین کرتا ہے۔

حادثاتی موت بھی Cause and Effect کے اصول کے تحت ہی ہوتی ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کے جو واقعات پیش کئے ہیں وہ بھی قرآن کی آیت کی روشنی میں بالکل واضح ہیں۔ یعنی پھگواڑہ جانے کے لئے جالندھر کے سٹیشن پر جو واقعہ پیش آیا اس میں ڈاکٹر صاحب نے خود ہی جواب بھی لکھ دیا ہے کہ اگر میں کمزور ہوتا تو ہاتھ چھوٹ جاتا اور موت کے منہ میں چلا جاتا۔ دوسرے واقع میں بھی دریا کا پانی چڑھنے اور اس سطح پر جہاں کوئی انسان بھی ڈوب کر مر سکتا تھا' سے پہلے جو کوئی بھی دریا سے نکل آیا بچ گیا۔ باقی بہہ گئے۔

تیسری مثال میں Crator میں چھپنے سے زندگی کا بچنا اور چوتھی مثال میں اپنے بنکر سے موت کے وقت سے دو منٹ پہلے بٹالین کمانڈر کے بنکر میں چلے جانے سے موت کا ٹل جانا یا پھر قیام پاکستان کے وقت کے واقعات میں بھی طبعی اور معاشرتی حالات کی سوجھ بوجھ اور عقل کے استعمال سے موت کے منہ سے بچتے رہنا۔

میری رائے میں ان تمام مثالوں اور واقعات کی رو سے قرآن کی آیت میں کہیں بھی دو مختلف یا اختلافی نظریات قائم کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

بزرگ و محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے یہ مضمون لکھ کر غور و فکر کی دعوت دی۔

---

## مجرم کون

سفارش کی پرچی ہاتھ میں لئے سائل افسر اعلیٰ کے پاس آتا ہے۔ صاحب یہ کام نہیں کرنا چاہتے۔ پھر بھی وہ خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں اور درخواست وصول کر کے کلرک کے پاس بھجوا دیتے ہیں۔ درست ہے! یہی ہونا چاہئے تھا۔ کام نہ ہونا تھا۔ نہ ہوا۔ تین دن بعد دوبارہ رابطہ قائم کرنے پر افسر کلرکوں کی کام چوری' نااہلی اور بددیانتی کا رونا رو دیتا ہے۔ کلرک بیچارا اپنی جگہ مجبور کہ صاحب نے اپنے مختصر دستخط کے نیچے چھپا کر LBW لکھ دیا ہے۔ LBW کا مطلب آپ کے نزدیک بھلے جو بھی ہو۔ کلرک سمجھتا ہے کہ اس کا مطلب Let The Bugger Wait ہے۔ افسر اپنی جگہ مجبور کہ سفارشی پرچی پر دستخط اس سیاہی سے کئے گئے ہیں جس کا مطلب کام نہ کرنے سے ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منظور احمد خان (ناروے)

# پیام خزاں "95"

موسم کے حوالے سے' ناروے میں اکتوبر کا مہینہ' اداسیوں اور محرومیوں کی علامت بن چکا ہوا ہے- موسم خزاں' اپنے ظلم کی انتہا پر ہے- پتے گھبرا کر زرد ہو چکے ہیں- کچھ غصے میں تلملا کر سرخ ہو گئے ہیں- بہت سے گر کر بکھر چکے ہیں- سرد ہوائیں ان اداس فضاؤں کو مزید گہرا اور گھمبیر بنا رہی ہیں- اندھیرے' دن بدن پھیلنے لگے ہیں- روشنی روز بروز گوشہ نشین ہو رہی ہے- یہ قانون فطرت ہے جو مسلسل سرگرم عمل ہے اور کبھی نہیں رکتا-

موسموں کی آمدو رفت یہاں شدت سے محسوس کی جاتی ہے دو اجنبیوں کی گفتگو کا آغاز موسم ہی کے ذکر سے ہوتا ہے- (ہم ٹھہرے بے حس) ان لوگوں کو کانٹوں میں بھی پھولوں کی تلاش رہتی ہے-

چند ہی دنوں بعد ہر طرف برف ہی برف ہو گی- دور دور تک یوں نظر آئیگا جیسے کوہ دامن کو سفید کفن پہنا دیا گیا ہو-

یہ کفن' سفید ہی کیوں ہوتا ہے؟ بہت کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے لیکن' کیا کروں؟ لطیف چوہدری صاحب (ایڈیٹر) ڈانٹ دیتے ہیں کہ تم پٹڑی سے اتر جاتے ہو- (پٹڑی ہے ہی کہاں؟؟؟؟؟) وہ خود بھی جانتے ہیں کہ سفر چاہے ایک ہی سمت میں کیوں نہ ہو' دائیں بائیں بکھرے نظارے دامن گیر ہو ہی جاتے ہیں- ایڈیٹر صاحب نہیں چاہتے کہ میں ان نظاروں کا ذکر بھی کرتا چلوں- بجائے نوک پلک سنوارنے کے' ہاتھ میں ٹوکا لئے' یہ حضرت میری منظر کشی کو اس بے دردی سے کاٹ دیتے ہیں کہ خزاں کی تباہ کاریاں بھی ماند پڑ جاتی ہیں- اب انہیں کون بتائے کہ ؎

سو عیب سے بڑھ کر ہے پیری میں یہ اک عیب
کمبخت یاد آتے ہیں قصے شباب کے

بات خزاں کی ہو رہی تھی جو اپنی سالگرہ' نہیں' برسی منا کر اس ماہ رخصت ہو جاتی ہے- اور اس کے ساتھ ہی نئی گہما گہمی عود کر آتی ہے- تحقیق و جستجو کے اجلاس پھیلنے لگتے ہیں- بحث و تمحیص کی محفلیں جمنے لگتی ہیں- بند کمروں میں لوگ سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں یہ سوچنے کے لئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونا چاہئے؟

نارویجن لوگ سوچتے بہت ہیں- اور اب تو سوچنا گویا ان کی عادت سی بن چکی ہے- جب دیکھو جہاں دیکھو' بحث و مباحثہ گرم ہے- ہر نئے دن کوئی نہ کوئی موضوع یا معاملہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں- ہماری حالت مختلف ہے- ہم پہلے عمل کرتے ہیں پھر سوچتے ہیں----- ہم عمل پسند لوگ ہیں- ("مشورہ" بھی کرنا پڑ جائے' تو عمل کر لینے کے بعد کرتے ہیں----- ان کا سارا وقت کاروبار زندگی میں صرف ہوتا ہے یا غور و فکر میں (میری سمجھ میں تو آج تک یہ بات نہیں سما سکی کہ یہ دکاندار اور کاروباری لوگ اپنے بچوں کو وقت کب دیتے ہیں؟ بھلا ہو انڈین فلموں کا' جو انہوں نے بچوں کو گھر پر

باندھ رکھا ہوا ہے پاکستان میں تو پھر بھی مائیں گھر پر ہوتی ہیں' لیکن یہاں تو یہ سہولت بھی نہ چھوڑی ہم نے۔

او بھلے لوگو ! اپنا نہیں' تو اپنی نئی نسل کا تو کچھ خیال کرو۔ سوچو ! کہ یہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟؟ ایک سر چڑھتے معاشرے (Security Challengeing) میں قدم رکھا ہے۔ کچھ تو اپنی شناخت اور قیامت موجود کی طرف بھی دھیان دو ! کہتے ہیں: "وہ کیا ہوتی ہے؟ مطلب کیا ہے تمہارا؟" (یہ جوابی فقرے' روح میں زہریلی پھانسوں کی طرح اٹک کر رہ جاتے ہیں)

حیرت ہے تو اس بات کی کہ مقامی لوگ تو اپنی آج کو اپنی کل سے بہتر بنانے میں شب و روز مگن ہیں لیکن ہمیں نہ اپنی فکر ہے نہ اپنی آنے والی نسل کی۔ شائد ایسا اس لئے ہے کہ اول تو ہم کم علمی اور کوتاہ ذہنی کی وجہ سے' زندگی اور ذات انسانی کے حقائق و لوازمات سے لابلد ہیں' اور سمجھتے ہیں کہ محض مادی آسائش ہی مقصد حیات ہے۔ یہاں آکر یہ سب کچھ مل رہا ہے' یہی The Best ہے اور اسی کیساتھ چپکے سے چپکے رہو' یہ جو مسلمانوں میں بھی دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں' فقط پاگل ہیں' خواہ مخواہ سوچتے رہتے ہیں اور ہمیں بھی بلاوجہ پریشان ہونے پر اکساتے رہتے ہیں۔ یہاں پیسہ ہی تو کمانے کو آئے ہو' پیسہ کماؤ اور اللہ اللہ خیر سلا۔ دوم' ہماری ذہنیت ہی کچھ ایسی بن چکی ہوئی ہے کہ ہم کسی دوسرے کے خون پسینہ کی بنی بنائی جنت میں رہ کر بڑے محظوظ ہوتے ہیں۔ بھیک اور بخشش میں ملی ہوئی جنت میں ہم بہت خوش' مطمئن اور مسرور رہتے ہیں۔ خود آگہی تو دور کی بات ہے' خود داری بھی چھو کر نہیں گزری۔ چاپلوسی کو' اخلاق و مروت کا نام دے کر باچھیں جو ایک دفعہ کھلتی ہیں' دوبارہ بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں--- اور نہیں سوچتے کہ خیرات میں ملی ہوئی جنت' آدم کو بڑی مہنگی پڑی تھی۔ ایک ہی غلطی پر وہ باہر پھینک دیا گیا تھا۔ "اپنی فلاحی ریاست کی فکر کرنا یا اسے سنبھالے رکھنا' صرف انہی غیر مسلموں کا کام ہے' (جیسے ان غیر مسلموں سے یہ کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو) وہ کر رہے ہیں۔ اس میں ہمیں پریشان ہونے یا سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ہے ہماری سوچ اور برجستہ جواب۔ کیا سمجھے آپ؟ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی----- تو اکتوبر کا مہینہ گویا آغاز ہے فکر و تحقیق کا۔ یہاں سرکاری حلقوں کی جانب سے اٹھائی گئی آج کل کی بحث' جس کا براہ راست تعلق ہمارے اور ہمارے دین کے ساتھ ہے' کا موضوع ہے (ناروے کے سرکاری سکولوں میں) "توسیع شدہ عیسائیت" کا اجراء۔

ناروے' جس کا سرکاری مذہب عیسائی ہے' کے سرکاری سکولوں میں فی الوقت 'عیسائیت' اور 'نظریہ ہائے زندگی' (Livssyn) کے دو الگ الگ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ بچوں کیلئے ان دو مضامین میں سے ایک کا انتخاب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ عیسائی والدین' ظاہر ہے' اپنے بچوں کے لئے عیسائیت منتخب کرتے ہیں' لیکن دوسرے تمام غیر مذاہب اور غیر عیسائی' جن میں مسلمان بچے بھی شامل ہیں' عموماً (Livssyn) نظریہ ہائے زندگی' کا مضمون پڑھتے ہیں (دیکھا گیا ہے کہ چند فی صد پاکستانی مسلم بچے مذکورہ مضمون بھی پڑھنے سے کتراتے ہیں' جس کی وجہ ان کے والدین کی اس مضمون اور اس کے مشمولات

(Contents) سے لا علمی ہے)- آگے بڑھنے سے پہلے' ضروری ہے کہ اس خصوصی مضمون کے بارے میں بتایا جائے کہ یہ ہے کیا؟ اسے بطور سکول مضمون کس نے اور کیوں شامل کرایا؟ (اور یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس ضمن میں آج یہاں اور مستقبل قریب میں دوسرے یورپی ممالک میں بھی' یہ موضوع زیر بحث آنے والا ہے- لہٰذا ضروری سمجھا گیا ہے کہ بذریعہ طلوع اسلام' ہمارا اس ضمن میں ایک ٹھوس اور معقول خیال و لائحہ عمل سامنے آجانا چاہئے- اس سلسلے میں' ناروے میں مختلف حلقوں کی جانب سے حتمی تجاویز کی وصولی کی آخری تاریخ 15 نومبر ہے)

یہ مضمون 'نظریہ ہائے زندگی' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' دراصل عیسائیت یا دوسرے مضامین کی طرح لازمی (Compulsary) مضمون نہیں ہے' بلکہ اختیاری (Optional) ہے جسے تحریری درخواست دے کر عیسائیت کے متبادل مضمون کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے- اس مضمون کا بنیادی مقصد ہے بچوں کو مختلف مذاہب کے بارے میں معلومات فراہم کرنا' دیگر تصورات زندگی سے روشناس کرانا' اخلاقیات (Ethics) اور اس کے درپیش مسائل سے آگہی اور بنیادی طور پر تمام مختلف عقائد و نظریات کی فہم و تکریم- پھر واضح کر دوں کہ اس مضمون میں تمام بڑے مذاہب کے بارے میں صرف معلومات (Informations) فراہم کی جاتی ہیں- کسی خاص مذہب میں یا کیلئے Educate نہیں کیا جاتا- دوسرے لفظوں میں بچوں کو مسلمان' عیسائی یا ہندو وغیرہ نہیں بنایا جاتا' انہیں صرف ان مذاہب اور زیادہ تر ان کے رسم و رواج کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں- اس مضمون کی بنیاد' انجمن اقوام متحدہ کے جاری کردہ متفقہ انسانی حقوق (Human Rights) پر رکھی گئی ہے' جو شاید ایک آدھ کے سوا ! سارے کے سارے قرآن کریم کے مطابق ہیں-

اس مضمون کو' 'انسانیت کے غیر مذہب پاسبان' (Humanists) نے عرصہ ہوا بطور مضمون رکھوایا تھا اور Humanism تو آپ جانتے ہیں کہ قریباً صد سالہ پرانی اس خلاف مذہب تحریک کا نام ہے جس نے دراصل عیسائیت کو غیر دانشمندانہ اور ناقابل عمل مذہب سمجھتے ہوئے' اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا- اور اعلانیہ مگر پرامن انداز سے "مرتد" ہو گئے تھے- یہ لوگ (Humanists) صرف عیسائیت ہی کے منکر (Non-Believers) نہیں ہوتے' بلکہ سرے سے روح مذہب (Spirit of Religion) ہی کے خلاف ہیں- (یہ علیحدہ اور بڑی دلچسپ بات ہے کہ اب یہ خود بھی' لاشعوری طور پر' ایک "مذہبی گروہ کی شکل اختیار کر چکے ہیں- ان کی خود اختیار کردہ مخصوص اجتماعی سرگرمیاں' خاص طور پر پیدائش اور موت کے موقع پر' ہوتی ہیں جن کا انعقاد و نگہداشت یہ لوگ بڑی باقاعدگی اور سختی کیساتھ کرتے ہیں-) یہ مضمون 'Livssyn' تمام غیر عیسائی یا غیر مذہب بچوں کیلئے انہی کا منوایا اور رکھوایا ہوا ہے- خود ہمارے بچے یہ مضمون پڑھتے آتے ہیں اور بہت مطمئن ہیں کہ اس کے ذریعے تمام بڑے مذاہب کا تقابلی جائزہ لینے Comparative Study میں بڑی مدد ملتی ہے- اب ہم چلتے ہیں اس نئی تحریک (Recent Move) یا تجویز کی طرف' جسے چند ماہ پہلے ناروے کی وزارت تعلیم و مذہبی امور کی جانب سے پیش کیا گیا اور جس کے خلاف' نجانے کیوں؟' مسلمان حلقوں میں اچانک غم و غصے کی لہر دوڑ گئی

(ہمارے اندر صرف لہریں ہی دوڑتی ہیں' حرکت ہم کبھی بھی نہیں کر پاتے کوئی- وجہ؟ وہی کہ ہم---- ایک---- نہیں ہیں' باوجود ایک خدا' ایک رسولؐ اور ایک قرآن کے حامل ہونے کے)- یہ تو خیر ہے ہی غم و غصے کی لہر' راحت و مسرت کی لہریں بھی صرف دوڑتی ہیں' کر وہاں بھی ہم کچھ نہیں سکتے- ہم تو ابھی تک ایک' متفقہ اللہ والی' مرکزی جامع مسجد بھی نہ بنا سکے' جس کا ہمیں حق ہی حاصل نہیں تھا بلکہ حکومت "ایں جا" نے وسط شہر میں جگہ دینے کے علاوہ بڑی فراخدلی کیساتھ مالی مدد دینے کا بھی وعدہ کیا تھا- آج اس جگہ' بڑے بڑے آرکیڈ کھڑے ہمارے مذہبی انتشار و افتراق کا مذاق اڑا رہے ہیں-

پہلے ہم وہ "متنازعہ" سفارشات پر مبنی رپورٹ مختصراً پیش کرتے ہیں- پھر اس پر مختلف اداروں کی طرف سے اٹھنے والے سوالات اور ان کا کمیٹی ہی کے سربراہ پیٹرسن وغیرہ کی جانب سے جوابات کے بعد اپنے نقطہ نظر پیش کریں گے- رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

"یہاں گذشتہ' چند دہائیوں کی امیگریشن کے نتیجہ میں' دوسرے مذاہب کے افراد بھی آگئے ہیں' جن میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد شامل ہے- اسلام ملک کا دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے- نارویجن معاشرے کے بدلتی حالات کے پیش نظر' یہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ سکولوں میں جانے والے بچے پہلی کلاس ہی سے بین المذہبی سوسائٹی کے تقاضوں سے کماحقہ' آگاہ ہوں- لہٰذا' پرائمری اور ہائی سکول (فی الوقت اول سے نہم تک لیکن' 97ء سے دہم تک' اور اس کے بعد سہ سالہ کالج میں بھی) میں 'عیسائیت' اور 'نظریہ ہائے زندگی' کے دونوں مضمونوں کے مشمولات اور تدریس کا جائزہ اور انہیں یکجا کرتے ہوئے' کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ

الف : 'توسیع شدہ عیسائیت' کے نام سے ایک نیا اور مشترکہ' لیکن وسیع اور جامع مضمون متعارف کروایا جائے جو سب طالب علموں کیلئے بلا تخصیص نظریہ و مذہب یکساں اور لازمی ہو- سب کو ایک دوسرے کے عقائد و نظریات کے بارے میں علم ہونا چاہئے-

ب : اس میں فلسفہ اور اخلاقیات کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ طالب علموں کے رویوں کی مثبت تشکیل ہو سکے-

ج : سکولوں میں متبادل علیحدہ مذہب یا نظریے وغیرہ میں تعلیم کا حق ختم کر دیا جائے- (اس حق یا گنجائش سے ابھی تک ہم فیض یاب نہ ہو سکے- وجہ وہی ہے کہ ہم---- ایک---- نہیں ہیں)

د : کمیٹی اس بات کو سمجھتی ہے کہ اس مضمون کے بعض مواد کی تدریس' بعض طالب علموں اور ان کے سرپرستوں کیلئے تشویش کا باعث بن سکتی ہے- اس لئے ان والدین کیلئے جو نارویجن چرچ کے رکن نہیں ہیں' اپنے بچوں کو متعلقہ پیریڈز سے استثناء دلوانے کا حق ہونا چاہئے نہ کہ پورے مضمون سے-

ر : پرائمری جماعتوں میں اس مضمون کی تدریس کا اہتمام یوں ہونا چاہئے کہ استثناء کی ضرورت کم سے کم پیش آئے- باقی رہے کالج تو:

الف : وہاں مذہبی تعلیم کی لازمی حیثیت جاری رکھی جائے-

ب : یہ مضمون' طالب علموں کو مذہب' فلسفہ'

اخلاقیات اور دیگر نظریہ ہائے حیات کی مختلف توجیہات کا تقابلی جائزہ لینے کے اہل بنا سکے اور بعدازاں یہ سلسلہ طالب علموں کے مابین ڈائیلاگ کا ذریعہ بن سکے۔

ج : چھوٹ کی گنجائش ختم کر دی جائے۔

د : آہستہ آہستہ کالج کے تمام شعبوں میں مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔

ر : تمام استادوں کی تدریسی صلاحیتوں کو بڑھانا بھی ضروری ہے۔

یہ تھا خلاصہ' سرکار کی طرف سے پیش کردہ تجاویز کا۔ اب ان سفارشات پر اٹھائے گئے چند بنیادی سوالات پیش کئے جاتے ہیں:

الف : ہمارے بچے کم عمری ہی میں تضاد و انتشار کا شکار ہو جائیں گے۔

ب : یہ بات ناقابل فہم ہے کہ ایک عیسائی ملک کے سرکاری سکولوں میں عیسائیت کی تدریس کا اہتمام' سیکولر بنیادوں پر کیا جائے گا' جبکہ سکولوں کے پاس اس شعبہ میں مناسب مہارت اور صلاحیت بھی نہیں ہے۔

ج : تجاویز تیار کرنے سے پہلے' دوسرے حلقوں کو شامل نہیں کیا گیا جو کہ ایک خلاف جمہوریت طرز عمل ہے۔

د : اسلام کے بارے میں جو کتابیں یہاں میسر ہیں' وہ نہ صرف ناقص ہیں بلکہ ان میں غلط اور متعصبانہ معلومات پیش کی گئی ہیں' جس سے اسلام کی مسخ شدہ شکل سامنے آتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیونکر توقع کی جا سکتی ہے کہ دوسرے طلباء' مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں کوئی مثبت رویہ اختیار کریں گے؟

ر : مجوزہ مضمون سے حق استثناء سلب کرنا' مایوس کن روش ہے۔

س : سکولوں میں مذہبی تعلیم کا جو نظام و طریقہ اس وقت رائج ہے' آخر اس میں کیا خرابی ہے جو حکومت کو نئی تجاویز پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ مروجہ نظام ہمارے لیے قدرے اطمینان بخش ہے' تاہم اگر حکومت مصر ہے تو اس نئے مشترکہ مضمون کا نام 'توسیع شدہ عیسائیت' کی بجائے 'Values' (Verdier) یا 'Objective Knowledge' رکھا جائے جس میں عیسائیت کے مواد و تدریس کو غیر ضروری اہمیت و ترجیح نہ دی جائے۔

یہ تھے وہ سوالات جو خاص طور پر پاکستانی حلقوں کی جانب سے ایک بھرے اجلاس میں خود کمیٹی سربراہ پیٹر سن اور ان کے معاون راسموسن کے سامنے پیش کیے گئے۔ پیٹر سن جواب دیتے ہیں کہ: "ہم بار بار اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ مجوزہ مضمون میں محض عیسائیت کے عقیدہ کی تعلیم نہیں ہو گی۔ اس مضمون کی صورت میں' اسکولوں میں ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی جہاں مختلف عقائد سے تعلق رکھنے والے' مل کر امور مذاہب کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔ ہمارے خیال میں صرف اس طرح سے ایک کثیر الثقافتی معاشرے میں سب کیلئے گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے۔ مذہبی تعلیم سے اقلیتی مذہبی گروپوں کو استثناء دینے کی سہولت ختم کرنے کی سفارش بھی اسی لیے کی گئی ہے۔ جب غیر عیسائی بچے امور مذہب کے مضمون کے چند پیریڈز سے غیر حاضر رہیں گے تو باہمی تفہیم

کے راستے ہموار نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود مضمون کے چند پیریڈز سے غیر حاضری کی گنجائش رکھی گئی ہے۔" انہوں نے مزید کہا کہ: "یہ تاثر غلط ہے کہ اسکول کو عیسائی مشینری کے طور پر استعمال کیا جائیگا۔ مذاہب کی تعلیم دینے والے استاد پیشہ ور استاد ہونگے نہ کہ مذہبی پیشوا۔ مذہبی تدریس کے ذریعے بچوں کی اپنی اپنی شناخت کو پختہ کیا جائیگا۔ کسی کی شناخت یا یقین کو متزلزل کرنا' نئے مضمون کا مقصد ہرگز نہیں ہوگا"۔ انہوں نے کہا کہ: "ہم یہاں مسلمانوں کا نقطہ نظر دیکھنے کیلئے آئے ہیں کہ کسی نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔ آپ کی طرف سے سامنے آنے والی تجاویز کا خیر مقدم کیا جائیگا کہ رپورٹ میں تبدیلی کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔ اس مضمون کو کوئی اور نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہی ہے کہ طلباء تقابلی جائزہ کے اہل بن سکیں' ایک دوسرے کی اقدار و روایات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور باہمی برداشت و احترام پیدا ہو"۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب آخر میں ہم اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں کہ' یہ کوشش' بجا طور پر قابل تحسین و آفریں ہے۔ مسلمانوں کو ایک سنہری موقع میسر آتا ہے کہ وہ صرف اپنے ہی بچوں کو نہیں' بلکہ دنیا جہاں کی آنے والی دوسری نسلوں تک بھی قرآن کا تصور پیش کر سکیں گے۔ اس سے بڑی اور کیا تعمیری پیش رفت ہو سکتی ہے جو خود غیر مسلموں کے ہاتھوں سامنے آرہی ہے؟ ہم خوفزدہ کیوں ہو رہے ہیں' کیا ہمیں اپنے قرآنی تصور پر ایمان و اعتماد نہیں؟؟؟؟ ہمیں اس سلسلے میں' تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے' بجائے چیں بجبیں ہونے کے ایک قابل عمل اور معقول لائحہ عمل (Approach) پیش کرنا چاہئے۔

یہ ایک کھلی اور قابل فہم حقیقت ہے کہ یہ ایک عیسائی ملک ہے' لہٰذا عیسائیت کی تعلیم و تدریس کا وجود اور اہمیت ان کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ اچھی بات ہے' اس شرط کیساتھ کہ

1- دوسرے تمام بڑے مذاہب کو بھی اتنی ہی وسعت و اہمیت دی جائے' تاکہ بچوں کو تقابلی جائزہ لینے میں غیر متعصب اور درست مدد مل سکے۔ لہٰذا'

2- اس مضمون کا نام بہرکیف بدلنا ہو گا تاکہ کسی بھی جانبداری کا شائبہ تک نہ پڑے۔ ہمارے نزدیک اس مجوزہ مضمون کا نام 'Values' یا 'Objective Knowledge' انتہائی مناسب رہے گا۔

3- مذہبی فرقہ واریت اور اس کے پیدا کردہ غیر ضروری اختلافات سے مبرا و منزہ ہو کر' قرآن پاک کی روشنی میں نئی اور متفقہ کتابیں جلد از جلد مرتب کی جائیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آسان کام نہیں ہے---- تاہم یہ بہرحال ناگزیر ہے۔ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے' ہمیں آج ثابت کرنا ہو گا کہ ہم واقعی ایک خدا' ایک رسولؐ اور ایک کتاب کے نام لیوا ہیں اور یہی وہ واحد اور آخری دین خداوندی ہے جس کی بدولت تمام انسانی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔

4- اور آخر میں رہی یہ بات کہ ہمارے بچے متزلزل عقائد کا شکار ہونگے تو یہ دعویٰ صرف درست ہی نہیں۔ بلکہ چپکے چپکے ہمارے ایمان کی کمزوری کی چغلی بھی کھا رہا ہے------- یہ خوف' عیسائیوں کو کیوں لاحق نہیں؟؟؟ ہمارا یہ تکرار و اصرار بھی غیر درست ہے کہ پہلے ہمارے بچوں کو اپنے عقائد میں پختہ ہو جانا چاہئے' پھر بعد میں دوسرے مذاہب وافکار

سامنے آنا چاہیں- یہ خیال' روح تبلیغ کے خلاف ہے- کیا ہم کسی عیسائی یا ہندو بچے کا شروع عمر میں مسجد آنا ناپسند کریں گے؟ اور اسے (اپنے دعویٰ کے مطابق) فوراً مسجد سے نکال باہر کریں گے کہ "جاؤ! پہلے اپنے اسلاف کے عقائد پختہ کرو' پھر آنا!" (پھر اس نے کیا لینے آنا ہے؟ عقائد تو اس کے پختہ ہو چکے ہونگے) ہم یقیناً یہ پسند نہیں کریں گے کہ غیر مسلم اپنے بچوں کے عقائد و اذہان یک طرفہ طور پر "دم پخت" کر دیں کہ آنے والے وقت میں انہیں اگر مسلمان کرنا تو درکنار الٹا ان کی اسلام دشمنی کا خوف لاحق ہو جائے- لہٰذا غیر مسلموں کا ناپسندیدہ فعل ہر طور غیر معقول ہے تو پھر وہی فعل ہمارے لئے کس طرح قابل تعریف ہو سکتا ہے؟

ہمارا یہ بھی مشاہدہ کہ ضروری نہیں کہ وہ بچے جنہیں شروع عمر میں ایک خاص عقیدے کی تعلیم ملی ہو' ساری عمر اسی پر قائم بھی رہیں- ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم جانوروں (جو اپنی پیدائش سے لیکر موت تک جانور ہی رہتے ہیں) کی بات نہیں کر رہے' انسانوں کے بارے میں بات ہو رہی ہے' جن میں بدل جانے کا امکان ہر لحظہ رہتا ہے- یہی وجہ ہے کہ کٹر مذہبی گھرانے کے بچے بھی بڑے ہو کر یا تو کھلم کھلا کفر کی راہ اختیار کر لیتے ہیں یا ساری عمر منافقت ہی کے خوفناک جھولے جھولتے رہتے ہیں- دوسری طرف' فرعون کے گھر موسیٰؑ بھی دیکھا گیا ہے- آخر میں ایک بار پھر اطلاعاً" عرض ہے کہ وہ مسلم' مسلم ہی نہیں جو کسی بھی دوسرے مذہب یا نظریہ حیات سے خوف زدہ ہو جائے- مسلم تو ان تمام افکار دنیا کو چیلنج کرتے نہیں تھکتا' وہ تو مبلغ ہے انہی فقروں کا کہ "آؤ! ذرا غور کرو' تم نے کیا دیکھا سنا اور میں کیا دیکھ سن رہا ہوں- فیصلہ بھی میں تم پر چھوڑتا ہوں"-

ذرا سی تجھ کو پلا کر تجھی سے پوچھوں گا
کہ کیف و مستی بادہ ہے کیا' سو کیا ہے؟
جناب شیخ سے کیسے' ہم الجھ پڑتے
ہزار مکر ہوں جس میں' وہ گفتگو کیا ہے؟
مشام جاں بھی معطر نہ ہو سکے جس سے
وہ گلبدن' بھلے سگند' وہ خوبرو کیا ہے؟؟؟

---

حدیث رسولؐ

من استوی یوماہ فھو مغبون

جس نے زندگی کے دو دن ایک جیسے گذار دئے، وہ نقصان میں رہا! (غبن ہو گیا)۔

یعنی جس کا آج اس کے کل ہی کی تصویر ہے' وہ خسارے میں رہا!
تو جس کا آج اس کے کل سے بھی برا ہو' اس کا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد خالد

# اصلاح معاشرہ کے قرآنی اصول

انسان جس معاشرے میں رہتا ہے یقیناً اس کی اصلاح کا فریضہ بھی خود اسی پر عائد ہوتا ہے گو اصول یہی ہے کہ ہر فرد اپنے افعال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے لیکن معاشرہ کے جو افراد نہ صرف خود بااختیار ہیں بلکہ بعض دوسرے افراد پر بھی بعض اعتبار سے اختیار رکھتے ہیں ان کی ذمہ داری دہری ہو جاتی ہے۔ ایک خود اپنی ذات کے بارے میں اور دوسرا دیگر متعلقہ افراد کے بارے میں۔ مثال کے طور پر والدین اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت کے ذمہ دار ہیں استاد اپنے شاگردوں کی اصلاح و تربیت کے ذمہ دار ہیں' ایک حاکم اپنی رعایا کے عام اخلاق کی درستگی اور اصلاح و تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ:

(ترجمہ) "تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک جواب دہ ہے اپنے گلہ کے بارے میں" گویا حاکم کی حیثیت ایک گلہ بان کی ہے۔ ایک انفرادی سطح پر اور دوسرے اجتماعی۔ چنانچہ ایک طرف انسان کے ذمے خود اپنی اصلاح کی ذمہ داری ہے یعنی خود بھی اللہ کا بندہ ہو اور دوسروں کو بھی اصلاح اور خیر کی دعوت دے اور برائی سے روکے۔ ارشاد ربانی ہے۔

(ترجمہ) "تم ایک بہترین امت ہو امت خیر ہو اور لوگوں کیلئے نکالی گئی ہو تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر پختہ یقین رکھتے ہو۔" (القرآن)

اسلام توحید و رسالتؐ اور عقیدہ آخرت کو اصلاح معاشرہ کے سنگ بنیاد کی حیثیت دیتا ہے۔ خاص طور پر عقیدہ آخرت انسان کے دنیاوی اعمال و افعال پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کا مقابلہ کوئی اور نظریہ یا عقیدہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

(ترجمہ) "جس کسی نے نیک کام کیا تو اس کا فائدہ اس کے اپنے لئے ہے اور جس کسی نے برائی کی تو وہ برائی خود اس کے آگے آئے گی" (القرآن)

آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل کی بنیاد اور اصلاح معاشرہ کے لئے تریاق کا کام کرتا ہے اس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے سامنے یہی دنیا ہے اور آخرت کا کوئی تصور موجود نہیں وہ اس چند روزہ زندگی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں آخرت کی جزا و سزا کا کوئی تصور ان کے ہاں موجود نہیں وہ جھوٹ اور سچ' حلال و حرام کی تفریق کو اپنے شب و روز کے عیش و آرام میں خلل انداز ہوتے دیکھیں تو ان کو معاشرتی برائیوں اور اخلاقی جرائم سے روکنے والی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اگر وہ کسی وقت ان برائیوں اور جرائم سے رکے رہتے ہیں تو ان کا ایسا کرنا حکومت کے تعزیری قوانین یا سوسائٹی کے دباؤ کے تحت ہوتا ہے لیکن خلوتوں اور

...انہ طریقوں پر جہاں حکومت اور پولیس کی ...نہیں انہیں کونسا امر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام اور مالی مفادات اور مادی منافع کو چھوڑ کر اخلاقی قدروں اور ضابطوں کی پابندی قبول کریں۔

وہ صرف عقیدہ آخرت اور خدا کا خوف ہی ہو سکتا ہے جو انسان کے ظاہر و باطن میں یکساں اخلاق عمل اختیار کرنے پر اس کے قلب و ضمیر کو ہمہ وقت آمادہ و تیار رکھتا ہے اس کیفیت کو اس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص تن تنہا ایک جنگل میں جا رہا ہے راستے میں اسے ایک تھیلی پڑی ملتی ہے وہ اٹھا لیتا ہے۔ کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں لاکھوں روپے ہیں اس کے آس پاس کوئی بشر نہیں جو اس کا گواہ ہو اور تھیلی پر پتہ بھی تحریر نہیں ہے ایک خدا فراموش شخص اس کو اٹھا کر گھر چلا جاتا ہے اور گلچھڑے اڑاتا ہے لیکن عقیدہ آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ اس کے تمام کاموں اور حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے اور اس نے خدا کو جواب دینا ہو گا۔ ان دونوں اشخاص کے درمیان امتیاز صرف عقیدہ آخرت پر ایمان ہے یہی وہ عقیدہ ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آیا کہ لوگ مسلمانوں کی صورتیں اور چال چلن دیکھ کر دل و جان سے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

اسلام معاشرہ کی اصلاح کیلئے علم دین کو عام کرنے پر خاص زور دیتا ہے کیونکہ علم دین کا اصل مقصد بندہ اور خدا کے درمیان تعلق کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا ہے جس پر انسان کی عملی زندگی کے استحکام کا دارومدار ہے۔ صحیح سمت میں جذبہ عمل کو بیدار کر کے اسلام فرد میں یہ احساس اجاگر کرتا ہے کہ وہ اچھے اعمال کرے اور معاشرے کے دوسرے افراد کو تکلیف نہ پہنچائے دوسروں کے حقوق غصب نہ کرے دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے نہ دائر کرے اور نہ جھوٹی گواہی دے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کے خلاف حرام مال نہ کمائے۔ دنیا کے ذلیل اور پست مقاصد کے حصول کیلئے شریعت کے خلاف طریقے اختیار نہ کرے۔ اسلام ایمان و عمل کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے ورنہ ناقص رہتا ہے ایمان و عمل کا التزام معاشرہ کی پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے۔

اصلاح معاشرہ کیلئے اسلام جس چیز پر زیادہ زور دیتا ہے وہ قول و فعل میں توافق اور موافقت و مطابقت ہے فی زمانہ ہمارے یہاں اصلاح معاشرہ کی جو کوششیں کی جاتی ہیں ان کی ناکامی یا بہت کم کامیابی کی ایک خاص وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے قول اور فعل میں مطابقت نہیں ہوتی ایسے افراد کو قرآن حکیم تنبیہ کرتا ہے کہ:

(ترجمہ) "اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے مسلمان بھائی کو عیب نہ لگاؤ"۔

اسلامی معاشرہ کا ایک اور اصول قرآن کریم میں یہ بیان ہوا ہے کہ لوگوں کو خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ "موعظۃ الحسنتہ" اچھی نصیحت کے طور پر سمجھاؤ اور ضرورت پڑنے پر ان کے ساتھ اچھے طریقے سے دلیلیں پیش کرو اور بحث کرو اصلاح

معاشرہ کے لئے۔

اگر ان قرآنی ہدایات پر عمل کیا جائے اور خود کو بھی ان لوگوں کے سامنے عملی نمونہ بن کر پیش کیا جائے تو یقیناً اس کے اچھے اثرات مرتب ہوں گے کیونکہ کم بختی اور کٹ حجتی سے بجائے فائدہ کے الٹا نقصان پہنچتا ہے۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے اپنے آپ پر نہ اتراؤ کہ بڑے متقی اور پرہیز گار ہیں۔ بڑے صالح اور ہدایت یافتہ ہیں بلکہ اپنے آپ کو بھی خیر کا محتاج سمجھنا چاہئے اور اپنے نفس کو بھی خیر کی تلقین کرتے رہنا چاہئے مبادا کہ شیطان نفس کو غرور میں مبتلا کر دے اور خیر کی توفیق ہی سلب ہو جائے۔ مقصود یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں اصلاح معاشرہ کے کام میں مشغول رہے۔ اس کے لئے الگ وقت نہ مل سکے تو جس کام اور پیشے سے متعلق ہے" اس میں خیر اصلاح کے پہلو نکال کر نیکیاں پھیلاتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا اور نیک عمل میں برکت فرماتا ہے۔

---

مضمون آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ یہ مضمون ہم نے حکومت پاکستان کی تنظیم مردم شماری کے مجلّہ "ہم لوگ" سے لیا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ قرآنی فکر کی ضرورت اب کہاں کہاں محسوس کی جانے لگی ہے۔ مدیر


## کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

| شہر و مقام | | دن | وقت |
|---|---|---|---|
| کراچی صدر | فاروق ہوٹل ہال۔ زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ | جمعۃ المبارک | 10 بجے صبح |
| حیدر آباد | 12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد | جمعۃ المبارک بعد نماز عصر | |

### دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر۔ جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ، مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ:

ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر، بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)

ٹیلی فون: کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حافظ محمد یعقوب خان تاجیک

# ارتقائے حیات

--- ماحول سے شعوری آگاہی کا انحصار زیادہ تر ہماری بصیرت پر ہے۔

--- جب انسان سوچنے کے عمل پر توجہ مرکوز کرتا ہے تو وہ عموماً اپنے اندرونی ذہنی عمل سے، خلا کی وسعتوں میں نظر کرتا ہے جو اس کے لئے دور اور ان دیکھی ہوتی ہیں۔

اور یہ ایسی کیفیات ہیں جب نفس انسانی نمایاں حصہ لے کر آگے آتا ہے اور پیشوائی کرتا ہے۔

--- اور جب اسی نفس کی (جو ایک نادر اور لاثانی شے ہے) تربیت ایسی مضبوط اور مستحکم ہدایت پر ہو جس کی تشریح قرآن کرتا ہے تو ذہانت اور راز و اسرار اور یادداشت اور خواب و خیال اور طرز کلام میں لازوال اضافہ ہو جاتا ہے۔

--- اور انسان کے ماورائے احساس------ کسی ایسی دریافت میں جائے بغیر کہ روح کا ڈیرا دماغ میں ہے یا اس کی ولایت دل میں ہے---- اور اس کے تصرف کی کوئی حد نہیں کیونکہ دماغ کے اندر بنی ہوئی اربوں باریک سے باریک چیزیں اور ان کے باہمی رشتے اور رابطے اور ان رابطوں کا کائنات کے اندر واقع ہونے والی تحریکات اور علامات سے تعلق، اور جسم کے اندر اعصابی اجزا کی ترتیب اور ان کی حسی اور مغزی خبر رسائی، اور پیدائش اور اس کے ارتقائی اعمال اور ان اعمال کا حیات سے تعلق، اور انسانی جسم کے خاتمے اور اس سے اگلی زندگی کے خدوخال ہمیں بتاتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے تمام جانداروں کی نسبت انسان نے آگے بڑھنا ہے۔ بلند ہونا ہے۔

وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ

اور نیک عمل اس کے کرنے والے کو بلند کرتے ہیں

(سورۃ فاطر آیت 10)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد عمر دراز

# اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ

(یہ مضمون 8 ستمبر 95ء کو بزم طلوع اسلام پشاور کے زیر اہتمام' ٹاؤن ہال پشاور میں منعقدہ جلسہ عام میں پڑھا گیا۔ مدیر)

اللہ تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لئے جو آخری اور ابدی ضابطہ ہدایت عطا فرمایا اس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

**بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○**

سزاوار حمد وستائش ہے اللہ کی وہ ذات جو تمام عالمین کا رب ہے۔

اور اس ضابطہ کا اختتام جس سورہ پر ہوتا ہے اس کی پہلی آیات میں یہ کہا گیا کہ

**قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ** یعنی اس اللہ کی پناہ طلبی جو الناس یعنی تمام بنی نوع انسان کا رب ہے۔

رب کے معنی ہوتے ہیں وہ ذات' وہ ہستی جو اپنی ہر مخلوق کو اس کے نقطہ آغاز سے لے کر' درجہ بدرجہ' حسب ضرورت' اس کے ارتقائی مراحل کے مطابق' سامان نشوونما مہیا کرتا ہوا' اس کے نقطہ تکمیل تک لے جائے۔ خواہ اس شے کا یہ ارتقا سلسلہ وار اور کڑی در کڑی ہو اور خواہ یہ فجائی (Emergent) طور پر سامنے آئے (رحمٰن و رحیم)

رزق بہم پہنچانے کی اپنی اس ذمہ داری کو اس نے مزید واضح کرنے کے لئے کہا کہ

**وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا** - (11/6)

اس روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ

**لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ** (17/31)

اپنی اولاد کو رزق کی تنگی کے خوف سے مت مار ڈالو۔ ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔

ظاہر ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے اس نے جملہ وسائل رزق کو اپنی ملکیت میں رکھا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں حصول رزق کے دو ذرائع ہیں' موہبات ربانی اور مصنوعات انسانی۔

مصنوعات انسانی اس وقت میرے موضوع سے خارج ہیں لیکن اتنا تو ان کے متعلق بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ مصنوعات انسانی کے لئے جملہ وسائل اور علم و ہنر بھی تو اللہ ہی کے عطا کردہ ہیں۔ اس لئے درحقیقت یہ بھی موہبات ربانی ہی کی ایک شکل ہیں **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا** (2/31)

موہبات ربانی ساری دنیا میں بکھری پڑی ہیں لیکن ان سے رزق حاصل کرنے کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے جیسے زمین سے فصل اگانا یا سمندروں سے شکار کرنا۔

قرآن کریم کی بیشتر آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ نے اپنی مشیت کے مطابق جب اس کرہ ارض پر انسان کی تخلیق کی' تو اس سے بہت پہلے اس نے زمین میں وہ تمام عناصر رکھ دیئے جو اس کے حصول رزق کے لئے ضروری تھے۔ ارشاد ہے۔

**هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا** (2/29)

اور **وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ** (7/10)

قصہ آدم میں ہبوط آدم کے وقت اس سے کہہ دیا گیا کہ

**وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ** (2/36)

تمہیں اس زمین پر ایک معین مدت تک رہنا ہے اور اسی میں تمہارے لئے متاع حیات ہے۔ چونکہ انسان کے تمام وسائل رزق' زمین ہی سے حاصل ہونا تھے' اس لئے فرمایا کہ ہم نے اسے (کسی خاص گروہ' طبقہ یا قوم کے لئے نہیں بنایا بلکہ) **سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ** (41/10) ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھا ہے اور کہا کہ اس پر کسی فرد یا گروہ کی ملکیت نہیں ہو گی بلکہ ہم ہی اس کے واحد مالک ہوں گے۔ **اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ** (7/128)

**اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ** کہنے میں کیا بات مضمر ہے اس پر غور فرمایئے۔

اللہ نے کعبہ (یعنی مرکز نظام ربانی) کو "بیتی" یعنی میرا گھر کہا ہے (2/125)۔ یوں تو اس سارے سلسلہ ارض و سماء میں وہ کون سی چیز ہے جو اس کی ملکیت نہیں لیکن کعبہ کو بالخصوص میرا گھر کہنے میں مقصد یہ ہے کہ یہ **وُضِعَ لِلنَّاسِ** (3/95) یعنی تمام انسانوں کے فائدہ کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس خالق کائنات اور مالک حقیقی نے یہ کہا کہ میرا یہ گھر **وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ** (22/25) یہ مسجد الحرام ہم نے تمام نوع انسان کے لئے مختص کر دی ہے خواہ وہ یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آئے ہوں۔ ہم نے اپنے اس گھر کو سب کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔

لہٰذا ان تصریحات قرآنی کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس چیز کی ملکیت کو بھی اللہ نے اپنے لئے مختص کیا ہے' وہ درحقیقت تمام بنی نوع انسان کی منفعت و استفادہ کے لئے ہو گی اور کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جائے گی۔

اس طرح جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ **اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ** (7/128) بلاشبہ یہ زمین' تمام کی تمام' اللہ ہی کی ہے تو ساتھ ہی فرما دیا کہ ہم نے اسے **وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ** (55/10) تمام مخلوق کے مشترکہ فائدہ کے لئے بنایا ہے۔

چونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اللہ نے اپنی مخلوق کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے' اور درحقیقت وہی رزق دینے والا ہے (جی نہیں چاہتا کہ یہاں سے حضور نبی اکرمؐ کی وہ درخشندہ حدیث بیان کئے بغیر گذر جاؤں جو اس ضمن میں قول فیصل ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ رازق یعنی رزق دینے والا تو اللہ ہی ہے میں تو صرف قاسم ہوں یعنی میری ذمہ داری تو صرف اسے تقسیم کرنے کی ہے)۔ اس لئے اللہ نے کہا کہ۔

**یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ**

السَّمَآءَ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (2/21)

اے نوع انسان! تم سب اس رب کی اطاعت و فرماں پذیری اختیار کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ یہی ایک طریق ہے جس سے تم سفر زندگی کے خطرات سے بچ سکو گے۔

یہ رب وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نیچے بچھی ہوئی اور آسمان کو اوپر چھایا ہوا بنایا اور پھر آسمان سے پانی برسایا اور اس سے اس نے تمہارے لئے سامان رزق پیدا کیا۔

اس کے بعد جو کچھ کہا وہ گہری توجہ کا متقاضی ہے! اس نے کہا کہ یہ تمام سامان زیست تمہیں اللہ کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا گیا اس لئے کہ تمہیں رزق بہم پہنچانے کی ہماری ذمہ داری پوری ہو لہٰذا جب یہ سب عطا کرنے والے ہم ہیں تو تم ایسا نہ کرنا کہ ان وسائل رزق کو اپنی ملکیت میں لے کر ہمارے ہمسر "انداد" بنا ڈالو۔ اگر تم علم و عقل سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ ہمارا کوئی ہمسر نہیں ہو سکتا۔

ہمسر کے لئے اس آیت میں انداد کا لفظ آیا ہے جو 'ند' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کا ایسا مقابل یا مثل یا نظیر بنانا جس میں بعینہٖ وہی صفات ہوں جو اس ذات کے لئے خاص ہیں جس کا اسے مقابل بنایا جائے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم اللہ کے مقابلہ میں ایسی طاقتوں کو تسلیم مت کرو جنہیں تم بزعم خویش سمجھتے ہو کہ وہ اللہ کی اس بنیادی خصوصیت رزاقیت میں شریک ہیں۔ ایسا سمجھنا باطل ہے اس لئے کہ جن کے متعلق تم ایسا سمجھتے ہو ان کی حالت یہ ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ (16/20)

وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے وہ تو خود ہمارے پیدا کردہ ہیں۔

سورہ عبس میں ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے رزق پر غور کرے اور سوچے کہ اس میں سے کون سی چیز ایسی ہے جو اس کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ زمین میں پیداوار کی صلاحیت موجود ہونا' بادلوں سے پانی کا برسنا' اس سے بیج کا پھوٹ کر کونپل بننا۔ کونپل کا بڑا ہو کر پودا بننا۔ پودے سے پھل اور اناج پیدا ہونا۔ یہ سب اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا انہیں مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (80/24-32) ہونا چاہئے یعنی تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامان زندگی نہ' یہ کہ لکیریں کھینچ کر اس کے مالک بن بیٹھو۔ خود تو عیش اڑاتے پھرو اور کاشتکار بے چارے بھوکے مر جائیں۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے اس بات کو اپنی ایک مختصر سی نظم میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور اس نظم کا عنوان ہی انہوں نے الارض للہ رکھا ہے۔ کہتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار
خاک یہ کس کی ہے' کس کا ہے یہ نور آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

یعنی تم تو صرف زمین میں بیج بو دیتے ہو' اس بیج کو فصل میں ثمربار کرنے کے لئے جن عناصر کی ضرورت ہے یعنی نمی' حرارت' سازگار ہوا' موسموں کا تغیر' جو کونپل نکلنے کے وقت کچھ اور خوشہ پکنے کے وقت کچھ

اور ہوتا ہے' یہ سب کون پیدا کرتا ہے۔ کیا تم انہیں پیدا کرتے ہو یا یہ صرف اللہ ہی کی عنایات ہیں۔ اگر تم انہیں پیدا نہیں کرتے تو پھر یہ بھی تسلیم کر لو کہ

وہ خدایا ! یہ زمیں' تیری نہیں' تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں

بلکہ **اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ** یہ زمین صرف اس مالک حقیقی اللہ ہی کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام و اقدار و فرمودات تو ان لوگوں کے لئے ہی ہیں جو اس میں بیان کردہ صداقتوں پر دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتے ہوں۔ یعنی مومنین ہوں۔ جو مومن نہیں ان کے لئے **سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَ اَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ** (2/6)- برابر ہے اے رسول کہ آپؐ انہیں ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کریں یا نہ کریں' وہ ان صداقتوں پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔

اب دیکھئے کہ مومن بننے کے لئے کیا کرنا پڑتا ہے۔ کیا صرف زبانی اقرار سے انسان مومن بن جاتا ہے؟ نہیں' بلکہ اسے اللہ کے ساتھ ایک معاہدہ بیع و شریٰ کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاہدہ سورہ توبہؓ کی آیتہ 111 میں محفوظ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ یہ کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

**اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط**

مومنین سے اللہ نے ان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں اور اس کے بدلے انہیں جنت عطا کی ہے' یعنی ایسی زندگی جس میں ہر ضرورت' ہر وقت' ہر جگہ بآسانی پوری ہو سکے۔

لہٰذا جب مومن بنتے وقت' انسان اپنی تمام تر متاع' یعنی جان اور مال تک اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو پھر اللہ کی ملکیت' زمین کو اپنے قبضہ اختیار میں لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی نقطہ کو ایک اور طرح سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ آج آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمین کا یہ ٹکڑا میری ملکیت ہے اس لئے کہ میں نے اسے فلاں شخص سے اس قدر رقم کے عوض خریدا ہے۔ آپ اس بیع و شریٰ کو پیچھے کی طرف لے جانا شروع کیجئے تاآنکہ آپ اس شخص تک پہنچ جائیں جس نے سب سے پہلے زمین کے کسی ٹکڑا کو اپنی ملکیت میں لیا تھا۔ فرمایئے کہ اس نے اسے کس سے خریدا تھا۔ ظاہر ہے کسی سے بھی نہیں۔ اس نے کیا یہ تھا کہ کسی طرح بھی کچھ قوت جمع کی اور زمین کے ایک حصہ پر لکیر کھینچ کر کہہ دیا کہ یہ میری ہے۔ اب یہ بات تو مسلم ہے نا کہ جو قبضہ' طاقت کے بل بوتہ پر دھاندلی سے کیا جائے وہ قانون کی نظر میں باطل ہوتا ہے۔ لہٰذا جب پہلی ملکیت ہی باطل ٹھہری تو اس کے بعد اس کے تمام بیع و شریٰ اور انتقالات ملکیت باطل قرار پاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے چوری کا مال خریدنے سے جائز نہیں ہو جاتا بلکہ قانون کی نظر میں جرم قرار پاتا ہے اور اگر خریدنے والا یا بیچنے والا پکڑا جائے تو سزا پاتا ہے۔

اب تک یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہئے کہ زمین کا مالک صرف اللہ ہے اور چونکہ اس کا کوئی حصہ بھی اس نے کسی کے ہاتھ خود فروخت نہیں کیا اس لئے آج کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے اپنی ذاتی ملکیت جتائے یا اسے کسی دوسرے کے پاس فروخت کرے۔ اس بات کو حضرت علامہ اقبالؒ نے ایک بار پھر اپنی جاوید نامہ کی ایک نظم میں بیان کیا ہے جس کا انہوں نے عنوان "ارض ملک

خداست" رکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

باطنِ الارض للہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند' کافر است

یعنی الارض للہ میں جو حقیقت مضمر ہے وہ ہر ایک پر عیاں ہے اور جو اس حقیقت سے چشم پوشی کرتا ہے اور اسے تسلیم نہیں کرتا' وہ کافر ہے۔

یہ بات اب عیاں ہو گئی کہ زمین سے حق انتفاع یعنی فائدہ اٹھانے کا حق ہر ایک انسان کو حاصل ہے' صرف انسان ہی نہیں بلکہ ہر ذی حیات کو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

**جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ**

(15/20)

ہم نے اسے تمہارے لئے بھی وجہ معاش (یعنی روزی کا سامان) بنایا اور اس کے لئے بھی جسے تم رزق مہیا نہیں کرتے۔

اس لئے اسے کسی کی ذاتی ملکیت میں دینے کا مطلب ہو گا کہ تم دوسرے انسانوں سے' اس سے انتفاع کا حق چھین رہے ہو انہیں اس سے فائدہ اٹھانے سے روک رہے ہو اور اللہ تعالیٰ رزق کے معاملہ میں اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔

زمین سے رزق کے اخراج کے لئے انسانی کوششیں ضروری ہیں اس لئے اسے رزق حاصل کرنے کی غرض سے انفرادی تحویل میں بھی دیا جا سکتا ہے اور اجتماعی تحویل میں بھی' جیسے کوآپریٹو فارمنگ۔ لیکن اس کی ملکیت کسی کی طرف منتقل نہیں کی جا سکتی۔

اور اس باب میں حرف آخر قرآن کریم کا وہ ارشاد ہے جو حضرت عمرؓ نے ایک ایسے وقت مومنین کے سامنے پیش کیا جب شام و عراق کی وسیع و زرخیز زمینوں کے متعلق یہ سوال اٹھا کہ آیا انہیں عہد رسولؐ اللہ اور خلافت صدیقیؓ کے قاعدے کے مطابق سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے یا اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہئے۔ اس غرض کے لئے بلائی گئی مجلس مشاورت میں ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھنے سے متعلق موافق اور مخالف آراء پیش کی گئیں تو حضرت عمرؓ نے تین دن کی مہلت مانگی اور اس دوران قرآن مجید پر گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ تیسرے دن جب پھر مجلس کا انعقاد ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کتاب اللہ پر مزید غور کیا تو للہ لحمد مجھے اس سے اپنی تجویز کے حق میں راہ نمائی مل گئی۔ اس کے بعد آپ نے سورہ حشر کی آیات 7 تا 10 تلاوت فرمائیں اور کہا کہ دیکھئے مال فے کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ اس میں :-

i- مہاجرین کا حق ہے۔
ii- انصار کا حق ہے۔
iii- اور ان دونوں کے بعد اللہ نے کہا ہے کہ اس میں ان کا بھی حق ہے **وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ** جو ان کے بعد آنے والے ہیں۔ روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس قرآنی استدلال کو سن کر صحابہؓ کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے اور موافقین و مخالفین سب جوش مسرت سے پکار اٹھے کہ آپ کی رائے بالکل درست ہے کہ یہ زمینیں مملکت کی اجتماعی تحویل میں رہنا چاہئیں۔ ہم سب آپ کی رائے سے متفق ہیں۔

قرآن حکیم کے اس مذکورہ حکم میں یہ بات شک و شبہ کی ہر رمق سے پاک' واضح ہو جاتی ہے کہ زمین میں چونکہ تمہارے لئے اور تمہارے بعد آنے والوں کے لئے رزق ہے' اسی لئے اسے کسی کی ذاتی ملکیت میں دے کر بعد میں آنے والوں کو اس کے رزق سے انتفاع کے حق سے محروم نہیں کیا جا

سکتا۔ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ تم نے اللہ کے مقابلہ میں انداد بنا لئے ہیں۔

**عملی تدابیر** ہمارے موجودہ حالات میں اگر حکومت یہ چاہتی ہے کہ اس ملک میں اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو تو سردست اس کے کرنے کا کام یہ ہے کہ۔

1- زمین پر بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور ساری زمین کو مملکت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ حکومت غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا ایک پلان بنائے اور اس پر فی الفور عمل درآمد شروع کر دے۔

2- ہر شخص کی تحویل میں (ملکیت میں نہیں بلکہ تحویل میں) اتنی زمین دے دی جائے جسے وہ خود کاشت کر سکے۔

3- حکومت اس زمین کے نقائص دور کرنے اور اسے تندرست و توانا بنانے کے لئے ضروری سامان اور اسباب مہیا کرے۔

4- حکومت خود فیصلہ کرے کہ کس قدر رقبہ میں کون سی جنس کاشت ہو گی۔

5- اس رقبہ کی پیداوار میں سے کاشت کرنے والے کی ضرورت کے مطابق' اس کے پاس رہنے دیا جائے اور باقی جنس کو حکومت ایک معقول اور مناسب قیمت پر خرید لے۔ اس رقم کو کاشتکار کی آمدنی قرار دیا جائے اور ملک کے عام انکم ٹیکس کے قاعدے کے مطابق اس آمدنی پر ٹیکس لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس سے مالیہ وغیرہ کچھ وصول نہ کیا جائے۔

6- فصلوں کی آفات ارض و سماوی سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری حکومت پر ہو۔ نیز کاشتکار کی بیماری یا اس کے مال مویشی کے نقصانات کی صورت میں اس کی مناسب امداد کی ذمہ داری بھی۔

7- ملحقہ دیہات کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے' میونسپل کمیٹی کے انداز سے اہل دیہات کی صحت' تعلیم وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ خدا کا یہ وعدہ کس طرح پورا ہوتا ہے کہ **لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ** (7/96)۔ اگر ان بستیوں والے خدا کے اس قانون کی صداقت کو تسلیم کر لیتے اور اس کی پوری پوری نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

ان دروازوں سے جو آمدنی آئے اسے ملک کی آمدنی کہا جائے گا اور اسی پر ملک کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہو گا۔ فلاح کے معنی ہی کھیتی کے ہیں۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ جس جہنم میں ہم آج جل رہے ہیں اس کی شعلہ باریاں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مزید تند و تیز ہوتی جائیں گی کہ

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

نہ صرف یہ بلکہ دین اور انسانیت بھی۔

اس سے بچنے کا طریق صرف یہ ہے کہ ہم اللہ کے ضابطہ قانون کے دامن میں پناہ لیں اور زمین کو ذاتی ملکیت کے پنجوں سے نکال کر ملت کی مشترکہ تحویل میں دے دیں۔ جو اسے ضرورت مندوں میں حسب ضرورت تقسیم کرتی رہے۔ اسی کا نام ہے اللہ کی ملک کو اللہ کے حوالہ کرنا۔

ملک یزداں را بہ یزداں باز دہ
تا زکار خویش بکشائی گرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر سید عبدالودود

# اَجَلًا مُّسَمًّی

موت کا اک دن معین ہے؟ کے عنوان سے ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کا مضمون آپ اگست 1995ء کے شمارہ میں دیکھ چکے ہیں۔ اس سے پہلے اسی موضوع پر "اجل مسمی"" کے عنوان سے ان کا مضمون مئی 75ء میں شائع ہوا تھا۔ جو قارئین کے مطالعہ کے لئے دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ جب انسان کی توانائیاں معراج پر ہوتی ہیں تو اس کی نگاہ کس قدر اُجلی اور سوچ کس قدر واضح ہوتی ہے۔ مدیر)

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّکُمْ ثُمَّ لِتَکُوْنُوْا شُیُوْخًا وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (40/67)

اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی پھر زندگی کو مختلف مراحل سے گذارتے ہوئے اسے اس مقام پر لے آیا) جہاں پیدائش نطفہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ پھر اس نطفہ کو (رحم مادر میں)۔ ایک لٹکتی ہوئی شے (Blasto Cyst) بنایا۔ پھر تم انسانی بچے کی شکل میں دنیا میں آئے۔ پھر تم جوانی کی عمر کو پہنچے ہو۔ پھر بوڑھے ہو جاتے ہو۔ پھر تم میں سے بعض جلدی وفات پا جاتے ہیں اور بعض مقررہ مدت Life Span تک پہنچ جاتے ہیں۔ (ہم نے یہ حقائق اس لئے بیان کئے ہیں کہ) تم ان پر غور و فکر کرو۔

حقیقتہً" مندرجہ بالا آیت کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ کے لفظ میں زندگی کی نمود سے پیشتر کرۂ ارض کے ابتدائی تین ارب سال میں بے جان مادہ کی ارتقائی منازل کا راز پنہاں ہے۔ پھر اسی طرح ثم من نطفة میں اس ارتقائی مرحلے کا ذکر ہے جب ہر نئی زندگی کی ابتداء (Reproductive Units) کے ذریعے شروع ہوئی۔ اس کے بعد انسانی بچے کی پیدائش۔ پھر جوانی اور پھر بڑھاپے کا ذکر ہے۔ ان تمام امور کو میں موجودہ دور کے سائنسی انکشافات کی رو سے اپنی کتاب--- (Phenomena of Nature & the Quran) میں تفصیلاً" بیان کر چکا ہوں۔ اس وقت زیر بحث اصطلاح اجلا" مسمی" ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ بعض لوگ جلدی مر جاتے ہیں اور بعض اجلا" مسمی" تک پہنچ جاتے ہیں۔ "اجل" کے لفظی معنی ایک مقررہ مدت کے ہیں اور یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً:

لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ (13/38)۔ ہر اجل کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔

وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا" مُّؤَجَّلًا" (3/144)۔ کوئی ذی حیات خدا کے مقرر کردہ قانون اجل کے بغیر نہیں مرتا۔

وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ

(35/11)- نہ کسی بڑی عمر والے کو عمر زیادہ دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی عمر کم کی جاتی ہے۔ مگر سب کچھ ایک قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں "قابل غور بات یہ ہے کہ وہ قانون اجل کیا ہے جس کے مطابق انسانی عمر بڑھتی گھٹتی ہے۔ اور پھر اجلا" مسمی" کیا ہے؟۔

یہ (Biology) علم حیاتیات کا وہ مسئلہ ہے جس پر موجودہ دور سے پہلے کبھی غور نہیں کیا گیا۔ اور ہمیشہ یہ سمجھا گیا کہ اس مسئلہ پر سوچنا لاحاصل ہے۔ لیکن گذشتہ چند سالوں سے سائنس دانوں نے اس موضوع پر بڑی جانفشانی سے تحقیق کی ہے۔ کئی برسوں سے (Lay Press) یعنی اشاعت کے وہ ذرائع جنہیں غیر سائنس دان کنٹرول کرتے ہیں) نے' اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور کہا گیا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں لوگوں کی عمریں اب پہلے سے بہت لمبی ہو گئی ہیں۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ انسانی زندگی کی مدت مقرر شدہ ہے' اس کے کیا معنی ہیں؟ عام طور پر عمر لمبی ہونے کا مطلب ایک فرد کی مدت عمر کا لمبا ہونا لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے اور وضاحت طلب۔

انسان کی موت' دو مختلف وجوہات سے واقع ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک حادثاتی ہے اور دوسری طبعی۔ اول الذکر میں مختلف قسم کی بیماریاں' حادثات اور ماحول کے اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ انسان کی پیدائش کے بعد اوائل عمر میں' بے شمار موتیں ہوتی ہیں جب ننھی جان بہت سی بیماریوں کی زد میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد بچپن میں بھی موتوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ازاں بعد حادثات' موسمی اثرات' زیادہ گرمی' زیادہ سردی' متعدی امراض و دیگر کئی قسم کے امراض سے موتیں واقع ہوتی ہیں۔ پھر بعض انسان (Predators) یعنی انسان سے زیادہ طاقتور درندوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا موتوں کو علاج معالجہ اور حفظ ماتقدم کے ذریعے روکا جا سکتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ انسانی موت کے وقت کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج سے تیس چالیس برس پیشتر' ہیضہ' پلیگ' ٹائفائیڈ' چیچک وغیرہ چھوت کی بیماریوں سے بے شمار انسان لقمہ اجل بنتے تھے۔ لیکن اب قریب قریب ان تمام بیماریوں پر قابو پا لیا گیا ہے۔ اب ان امراض سے شاذ و نادر ہی اموات واقع ہوتی ہیں۔ اللہ کا مقرر کردہ قانون یہ ہے کہ جب بھی مندرجہ بالا قسم کے امراض کے جراثیم انسانی جسم میں داخل ہوں گے تو انسان کی قوت مدافعت اور ان جراثیم میں باہمی کشمکش ہو گی۔ اگر قوت مدافعت غالب آجائے تو انسان زندہ رہ جائیگا اور اگر جراثیم غالب آجائیں تو انسان مر جائے گا۔ انسان کی قوت مدافعت ادویات اور دیگر ذرائع سے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا خون حادثہ کی وجہ سے ضائع ہو جائے تو دوسرے انسان کا خون اس کے جسم میں منتقل کر کے اس کو موت سے بچایا جا سکتا ہے۔ گویا میڈیکل پروفیشن کی تمام تگ و دو اس لئے ہوتی ہے کہ انسانوں کو موت سے بچایا جائے۔ بالفاظ دیگر "انسانی موت کے وقت" پر یہ قانون اثر انداز

[illegible] اور حادثات کو روکنے [illegible] ہیں۔ موجودہ زمانے کی [illegible] بیماریوں سے زیادہ اموات واقع [illegible] ہیں سرطان اور دل یا دوران خون کی [illegible]۔ دل اور دوران خون کی بیماریاں ورزش کی [illegible] چکنی غذا کی زیادتی، تمباکو نوشی، زیادہ تفکرات وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جن پر حفظ ماتقدم سے بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن سرطان کے مرض کے لئے تاحال کوئی حفظ ماتقدم کی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ لیکن اگر بالفرض سرطان پر پوری طرح قابو پا لیا جائے تو انسانی آبادی کی 2 فیصد کی زندگی کو اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ اور اگر ہم دل کی بیماریوں، خون کا دباؤ اور فالج وغیرہ پر پوری طرح قابو پالیں تو انسانی آبادی کی سات فیصد کی زندگی اور لمبی ہو سکتی ہے۔ گویا حادثات اور بیماریوں پر کنٹرول کی وجہ سے انسانی آبادی کے ایک مخصوص حصے کے موت کے وقت کو کچھ مدت کے لئے ٹالا جا سکتا ہے لیکن ان تدابیر کا بنی نوع انسان کی (Life Span) "اجلا مسمی" پر اثر نہیں پڑتا۔ ذی حیات اشیاء کی ہر نوع کے لئے اللہ تعالیٰ نے زندگی کی ایک معیاد مقرر کر دی ہے (نوع کا لفظ پیش نظر رکھے۔ مثلاً مکھی کی Life Span چالیس دن ہے۔ گویا اگر حادثاتی موت نہ ہو تو یہ چالیس روز کے بعد خود بخود مر جائے گی۔ اسی طرح چوہا تین سال کے بعد خود بخود مر جائے گا۔ گھوڑا تیس سال کی عمر کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک انسان قریباً یکصد سال کے بعد اپنی طبعی موت مر جائے گا۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل نقشہ ملاحظہ ہو۔

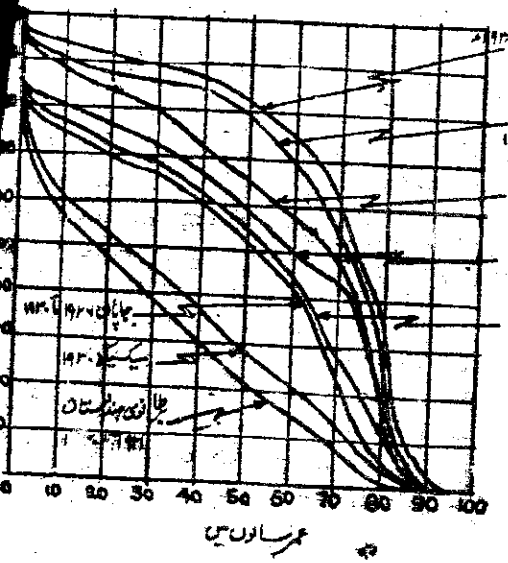




مندرجہ بالا نقشے میں دنیا کے مختلف ممالک کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک لاکھ آدمی مندرجہ ذیل سالوں میں فلاں فلاں ملک میں کتنی مدت زندہ رہے۔ مثلاً برٹش انڈیا میں 1921ء تا 1930ء - 40 سال کی عمر میں ایک لاکھ میں سے 35000 زندہ رہے، باقی مر گئے۔ اسی طرح امریکہ کی سفید فام آبادی میں چالیس سال کی عمر میں 1901ء سے 1902ء تک ایک لاکھ میں سے ساٹھ ہزار بچ رہے باقی مر گئے۔ پھر امریکہ میں 1939ء تا 1940ء میں، 40 سال کی عمر میں 80,000 باقی رہے باقی 20,000 مر گئے۔ نیوزی لینڈ 1934ء تا 1935ء میں، 40 سال کی عمر میں، 85,000 زندہ رہے باقی مر گئے۔

یہ مختلف ممالک میں زندگی کی لمبائی میں فرق اس لئے ہے کہ بعض ممالک نے بیماریوں اور حادثات پر دوسرے ممالک کی نسبت سے زیادہ قابو پا

لیا۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اعداد و شمار میں اتنے فرق کے باوجود ہر ملک کے سو فیصد انسان 90 یا 95 سال کی عمر میں مر گئے۔

اب دوبارہ آیت قرآنی (40/67)- کی طرف لوٹئے۔ پھر تم میں سے بعض جلدی وفات پا جاتے ہیں اور بعض ولتبلغوا اجلا مسمی یعنی (اجل) مقررہ مدت تک پہنچ جاتے ہیں۔ گویا نوع انسان کی اجلا" مسمی" 90 یا 95 سال کے قریب ہے۔ (انفرادی مستثنیات کا سوال الگ ہے)

انسان قریباً سو سال کے بعد کیوں خود بخود مر جاتا ہے۔ مکھی چالیس دن کے بعد کیوں مر جاتی ہے۔ کتا دس سال کے بعد کیوں مر جاتا ہے۔ چوہا تین سال کے بعد کیوں مر جاتا ہے۔ یہ موضوع (Science of Cytigenetics) سے تعلق رکھتا ہے اور اس ضمن میں حال ہی میں بڑی دلچسپ ریسرچ ہوئی ہے لیکن موضوع فنی قسم کا ہے اس لئے شاید غیر سائنس دان حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث نہ بن سکے۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ انسان (Cells) کا مجموعہ ہے اور (Aging Process) یا (Biomorphosis) کا عمل (Cell) بلکہ اس سے بھی نچلی سطح پر ہوتا ہے۔ یہ عمل انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور موت تک جاری رہتا ہے۔ (Cell) کا خاصہ یہ ہے کہ ایک سے دو' دو سے چار' چار سے آٹھ میں تقسیم ہونے کا عمل تمام عمر جاری رہتا ہے۔ لیکن جوں جوں انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے (Doubling) یا دگنے ہونے کے عمل کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے۔ اس عمل پر کون کونسے عوامل کارفرما ہیں' جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے یہ خالص فنی موضوع ہے۔ ایک (Theory) یہ ہے کہ (Cell) کا (Nucleic Acid) اپنے Blue Prints بنانے میں غلطیاں کرتا رہتا ہے اور (Cell) کے (Aging Process) کی تہ میں یہی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایک Free Radical Theory of Aging ہے۔ اس کے مطابق (Cell) کے آکسیجن کو استعمال کرنے کا عمل (Aging Process) کی بنیاد ہے۔ (Aging Process) کی وجوہات معلوم کرنے کے ساتھ ساتھ طبعی عمر کو لمبا کرنے کے تجربے بھی چھوٹے جانوروں پر کئے جا چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے اور ممکن ہے انسان کی طبعی زندگی میں بھی 5 سال تک کا اضافہ کیا جا سکے۔

بہرحال یہ تجربات تو ہوتے رہیں گے اور اگر کوئی مزید انکشافات ہوئے تو ہمیں لکل اجل کتاب کے مطابق پھر غور کرنا ہو گا۔ فی الحال میرا مقصد اجلا" مسمی" کے الفاظ قرآنی کی وضاحت ہے۔ نوع انسان کی عمر کی مدت مقرر شدہ ہے۔ بیماریاں اور حادثات صرف (Aging Process) کی وجہ سے لازمی موت کو قریب تر لے آتے ہیں۔

---

(طلوع اسلام۔ واضح رہے کہ اس میں نوع انسان کی طبعی عمر سے بحث کی گئی ہے نہ کہ افراد کی عمر سے۔ ہمارے ہاں جو یہ عقیدہ عام ہے کہ ہر شخص کی عمر پہلے سے متعین ہوتی ہے اور انسان خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرے' نہ اس میں ایک دن کی کمی ہو سکتی ہے نہ بیشی' سو یہ عقیدہ صحیح نہیں۔ تفصیل کے لئے پرویز صاحب کی تصنیف۔ کتاب التقدیر۔ ملاحظہ فرمائیں)

# پیر و مرشد

(حکیم محمد دین نسیم صاحب کی طویل نظم سے چند اشعار جو انہوں نے 23 مارچ کو چنیوٹ میں جشن نزول قرآن کی تقریب میں پڑھی)

وہ شرک جس کو خدا نے کہا ہے ظلم عظیم
گواہ جس پہ ہیں قرآن پاک کی آیات

جدھر بھی دیکھیں یہی شرک کار فرما ہے
ہیں بت پرستوں سے بدتر ہمارے معمولات

میرے خدا یہ زمانہ بھی کیا قیامت ہے
کہ سر اٹھائے ہوئے ہیں ہزارہا حشرات

کسی کا بچ کے نکلنا بہت ہی مشکل ہے
لگا کے بیٹھے ہیں صیاد ہر مقام پہ گھات

نہ زر کی خیر نہ محفوظ دولت ایماں
کہ دلفریب ہیں شیخ عجم کی ترغیبات

یہ پیر و مرشد و ملا یہ مصلحت کے غلام
یہ غلمان نمائش یہ بے عمل سادات

یہ مسندوں کے خلیفے یہ نائبانِ رسولؐ
یہ مقبروں کے مجاور یہ خواجگان حضرات

عطائے رزق، پسر، دختر اور شفا و مرض
ہر ایک کام میں یہ خود ہیں قاضی الحاجات

مراقبے میں یہ جائیں تو دیکھ لیتے ہیں
ہزار میل سے اپنے مرید کی حرکات

یہ اپنے کشف و کرامت سے روک دیتے ہیں
جو ہو چکے ہوں مقدر مصائب و آفات

قضا و قدر پہ بھی جبر و اختیار ان کو
ہے گویا قبضۂ قدرت میں رازِ موت و حیات

یہ سب خدا ہیں روایات کی شریعت کے
کہ ہو رہے ہیں جنہیں سجدہائے تعظیمات

نہ جانے ایسے خداؤں کی حیثیت کیا ہے
ہے جنکی صدقہ و خیرات پر گذر اوقات

رباب و طبلہ و طاؤس اگر عبادت ہیں
کہاں سے آئیں گے شوقِ جہاد کے جذبات

جواں لہو جو شہادت کی جان ہوتا ہے
بُلا رہا ہے جسے اب بھی عرصۂ غزوات

اسے تو عیش پرستی میں کر دیا مدہوش
اُلجھ کے رہ گئے نغموں میں اس کے احساسات

چھٹا جہاد، عبادت میں آئی موسیقی
ہیں پیر و مرشد و ملا کے کتنے احسانات

خدا کے دین میں ان کا کوئی وجود نہیں
دلیل انکے تقدس کی ہیں چند مفروضات

اگر خدا کو عمل سے نہ ایک مانیں گے
نسیمؔ ہو نہ سکے گی تلافیٔ مافات

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

# باغبان ایسوسی ایشن

کوڈ نمبر(1) نام _____ ولدیت _____ پتہ _____ دستخط

## فہرست پھل دار پودہ جات

### میدانی پھل دار پودہ جات مع تعداد

| | | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| 1 | Fightree | انجیر | 2 | Grape | انگور | 3 | Guava | امرود | 4 | Pineapple | انناس |
| 5 | Mango | آم | 6 | Jujube | بیری | 7 | Papaya | پپیتا | 8 | Jaman | جامن |
| 9 | Sapodilla | چیکو | 10 | Raspberyy | رس بھری | 11 | Olive | زیتون | 12 | Orange | سنگترہ |
| 13 | Falsa | فالسہ | 14 | Water-Chestnet | سنگھاڑا | 15 | Custard-apple | شریفہ | 16 | Date | کھجور |
| 17 | Mushroom | ککروندا | 18 | Kinnow | کنو۔ مالٹا | 19 | Banana | کیلا | 20 | Citron | گل گل بجورا |
| 21 | Lime | میٹھا | 22 | Mangosteen | مینگو سٹین | 23 | Coconut | ناریل | 24 | Rasins-Current | کشمش |

### پہاڑی پوٹھوہاری پودہ جات مع تعداد

| | | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| 25 | Chest Nut | اخروٹ | 26 | Recentplum | الوچہ | 27 | Persimon | املوک | 28 | Straw-Berry | آخا۔ سٹرابری |
| 29 | Pomegranat | انار | 30 | Peach | آڑو | 31 | Plum | آلو بخارا | 32 | Amla | آملہ |
| 33 | Almond | بادام | 34 | Botang | بٹنگ | 35 | Pyrus Malus | بگوگوشہ | 36 | Pistachio | پستہ |
| 37 | Filburt-Nut | چلغوزا | 38 | Cherry | چیری | 39 | Apricot | خوبانی | 40 | Apple | سیب |
| 41 | Mulbery | شہتوت | 42 | Loquat | لوکاٹ | 43 | Lichee | لیچی | 44 | Lemon | لیموں |
| 45 | Pear | ناشپاتی | 46 | | ناکھ | 47 | | ہاڑی | 48 | | سیاہ پہاڑی انجیر |
| 49 | | پہاڑی انار | 50 | | سفید ٹنگی | 51 | | عناب | | | |

### بیلدار پھل مع رقبہ

| | | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| 52 | Musk Melon | خربوزہ | 53 | Water Melon | تربوز | 54 | Kabli Melon | گرما۔ سردا | | | |

### ادویاتی پودہ جات مع تعداد

| | | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| 55 | Tamarind | املی | 56 | Betalunte Tree | چھالیہ | 57 | Soap-Nut | ریٹھا | 58 | Sebesteaz Plum | لسوڑا |
| 59 | Indian Lasurnum | املتاس | 60 | Myroba | ہلیلہ | | | | | | |


پتہ رابطہ :-

ملک حنیف وجدانی

صدر باغبان ایسوسی ایشن

معرفت PC No. 47224

موہڑہ سیداں مری



تعاون ترتیب و تکمیل

ڈائریکٹر صاحب محکمہ زراعت کوئٹہ

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد' بارانی زرعی یونیورسٹی راولپنڈی' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

(نوٹ :- تسلسل کے لئے دیکھئے طلوع اسلام فروری 95ء)

# معزز وابستگان تحریک طلوع اسلام!

السلام علیکم- کنونشن میں شمولیت کے لئے آپ کی تیاریاں یقیناً عروج پر ہونگی- کنونشن کا پہلا اجلاس (اراکین بزمہائے طلوع اسلام کے لئے) 19 اکتوبر 95ء بروز جمعرات 3 بجے بعد دوپہر ہو گا- آپ کو اس وقت تک ادارہ میں پہنچ جانا چاہئے- اپنی آمد کی اطلاع پیشگی دے سکیں تو انتظامات میں بہتری پیدا کی جا سکتی ہے- رہائش حسب سابق فرشی ہو گی- موسم کے مطابق بستر ہمراہ لایئے- رہائشی کیمپ میں داخلے اور شب بسری کے لئے بزم کی رکنیت یا ادارہ کا اجازت نامہ لازمی ہو گا- نمائندگان بزم اپنے ہمراہ آنے والے مہمانوں کی دیکھ بھال کے خود ذمہ دار ہونگے- رہائش کے دوران کھانے کا انتظام ادارہ کریگا-

21 اکتوبر بروز ہفتہ نمائندگان بزم کی حاضری لازمی ہو گی- نمائندگان بزم کے ہمراہ آنے والے دوسرے حضرات بطور مبصر شامل ہو سکیں گے-

جمعتہ المبارک 20 اکتوبر کے دونوں اجتماعات کھلے اجلاس ہیں جن میں شمولیت کے لئے کسی اجازت نامہ کی ضرورت نہ ہو گی-

لاہور میں جناب آفتاب عروج صاحب آپ کی پذیرائی کے لئے موجود ہونگے-

چشم براہ

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام